پروفیسر فتح محمد ملک

اقبال فراموشی



اقبال فراموشی

پروفیسر فتح محمد ملک

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

801.951 Fateh Mohammad Malik
Iqbal Framoshi / Fateh Mohammad Malik.-Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2002.
208p.
1. Iqbal aur Nizam-e-Hakoomat
2. Iqbal - Shairi - Tehqeeq. I. Title.

2002.

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1339-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

منو بھائی
کے
نام

آدمی دید است و باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

——— رومیؒ

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام، اے ساقی

تین مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام، اے ساقی

عشق کی تیغِ جگر دار اُڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام، اے ساقی

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام، اے ساقی

——— اقبالؔ

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ مضامین فقط ایک سوال سے پھوٹے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں اقبال کے انقلابی تصورات کے عملی امکانات بروئے کار کیوں نہ آ سکے؟ اس سوال کے بطن سے اس دوسرے سوال نے جنم لیا ہے کہ ہمارے ہاں فکرِ اقبال کے انقلابی ممکنات کا بروئے کار آنا دائرۂ امکان میں ہے بھی یا نہیں؟ یہ سوالات مجھ سے، آپ سے، ہم سب سے جواب طلب ہیں۔ ان کا جواب ڈھونڈنے نکلتا ہوں تو مجھے اقبال کی ایک نصیحت یاد آتی ہے اور وہ یہ کہ ترکِ دُنیا نہ کرو بلکہ ترکِ فرنگ کا راستہ اپناؤ۔ ہم اب تک یہ راستہ نہیں اپنا سکے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے بالادست طبقات وہی ہیں کہ جو تھے اور جنہیں اقبال نے ''مسجد فروش'' اور ''کلیسا دوست'' کہا تھا۔ اب تک ہم نے اپنی اجتماعی زندگی کے سنگین مطالبات کے حوالے سے فکرِ اقبال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ خود اقبال نے اپنے جانشینوں کو بڑی فراخدلی کے ساتھ یہ حق دے رکھا ہے کہ وہ اُن کے افکار کو رد و قبول کی چھلنی سے گزارنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہمیں اقبال کے تصورات کو رد کر دینے کا حق حاصل ہے مگر اس سے پہلے ہمارے لیے ان افکار کا سمجھنا بے حد ضروری ہے تا کہ رد کرتے وقت ہمیں بخوبی علم ہو کہ ہم کیا رد کر رہے ہیں؟......

......ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم بے سوچے سمجھے فکرِ اقبال سے کنی کاٹ کر عہدِ غلامی کے دوران اپنائے گئے راستوں پر بگٹٹ بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ قومی آزادی اور خودمختاری کی منزل ہماری آنکھوں سے غائب ہو چلی ہے۔ اقبال کو پڑھنا اور سمجھنا اس منزل کے نشانات کو سمجھنا ہے۔

اقبال کے تصورات کے عملی ممکنات میری توجہ کا مرکز و محور ہیں۔ میں نے اس کتاب میں تصورات کو عصری حوالوں سے سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری اس کوشش میں میرے رفیق کار جناب مختار احمد گوندل بھی برابر کے شریک ہیں۔ انہوں نے بڑی محبت اور محنت کے ساتھ اپنے کمپیوٹر پر اس کتاب کا مسودہ تیار کیا ہے۔ اس وقت مجھے عزیزم افضال احمد بھی بہت یاد آ رہے ہیں جن کے پیہم اصرار پر میں ان منتشر مضامین کی شیرازہ بندی میں زیادہ تاخیر کا مرتکب نہیں ہوا۔ تزئین و اہتمام کے لیے میں برادرم نیاز احمد کا شکر گزار ہوں۔

پروفیسر فتح محمد ملک

۱۶۔فروری ۲۰۰۲ء

۸۴۔سی، سیٹلائٹ ٹاؤن،
راولپنڈی۔

اقبال اور شیطان کا سیاسی منشور

ان دنوں اقبال کا ایک شعر ہمہ وقت دل و دماغ پر منڈلاتا رہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ وہ شعر آپ کو بھی سنا دوں:۔

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلاّ کو اُن کے کوہ و دمن سے نکال دو

یہ شعر سن ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آنے والی کتاب "ضربِ کلیم" کی ایک مختصر نظم بعنوان "ابلیس کا پیغام، اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں آیا ہے۔ صرف چھ اشعار پر مشتمل یہ نظم گویا شیطان کا وہ چھ نکاتی سیاسی منشور ہے جو اُس نے آج سے پینسٹھ (65) برس پیشتر جاری کیا تھا۔ ابلیس کے سیاسی فرزند تب سے لے کر اب تک اس فرمان پر کاربند چلے آرہے ہیں۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک یہ فرزندانِ ابلیس تازہ دم ہیں۔ آج کے عالمی حالات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابلیس اور اُس کے سیاسی فرزند ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اسی سیاسی منشور کی روشنی میں سرگرم عمل رہیں گے۔ ان دنوں ہمارے گردوپیش کی دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی روشنی میں اس چھ نکاتی منشور کی ہر شق تازہ تر معنویت سے لبریز آنے لگی ہے۔ اس مختصر نظم کی عصری معنویت کے پیشِ نظر اسے ایک بار پھر پڑھ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے:۔

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو!

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو!
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو!
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

درج بالا سیاسی منشور کی چوتھی شق افغانستان سے متعلق ہے۔ شیطان افغانوں کی دینی غیرت کو اپنے سیاسی مسلک کے لیے بے حد خطرناک سمجھتا ہے۔ اس خطرے کا تدارک افغانستان کے کوہ و دمن سے مُلا کو نکال باہر کرنے ہی سے ممکن ہے۔ افغانستان کے پہاڑوں اور وادیوں میں جب تک مُلا موجود ہے شیطان کا سیاسی پروگرام وہاں نافذ نہیں ہوسکتا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اقبال کی ساری کی ساری شاعری میں صرف یہی ایک مقام ہے جہاں مُلا کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ اقبال مُلا اور مُلائیت کے بہت بڑے دُشمن ہیں۔ وہ مُلائیت کو اسلام کی اصل پاکیزگی کی بازیافت اور اسلام کی وسیع النظر، انسان دوست اور حریت نواز حقیقی شکل کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ وہ علمائے حق کے فیضان کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر مُلائیت کو حقیقی اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اُن کے کلام میں لفظ مُلا اسمِ تحقیر ہے۔ مُلا اُن کے ہاں ولن کے روپ میں نظر آتا ہے۔ مگر درج بالا نظم میں افغان مُلا اُن کا

محبوب اور شیطان کا معتوب بن کر نمودار ہوا ہے۔ افغان مُلا سے اقبال کی اس عقیدت کی وجوہات افغانستان کی تاریخ سے برآمد ہوتی ہیں۔

مردِ کہستانی اور پھر افغان مُلا کے تاریخی کردار پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ مُلا افغانوں میں دینی غیرت کا نگہبان ہے۔ اُس نے اپنی گفتار اور اپنے کردار، ہر دو، سے برطانوی سامراج کو ہمیشہ شکست دی۔ رزم میں بھی اور بزم میں بھی۔ اُس نے نہ تو خوف و دہشت کے سامنے ہتھیار پھینکے اور نہ ترغیب و تحریص میں آیا۔ اقبال نے "محراب گل افغان کے افکار" کے عنوان سے اپنے مشہور سلسلۂ منظومات میں افغان مُلا کے فکر و عمل کی بڑی حقیقت افروز ترجمانی کی ہے۔ افغان بدن کی آسائش کے لیے اپنی روح کو نہیں بیچتا۔ وہ آزمائش کی گھڑی آنے پر ابلیس کی جانب سے پیش کی جانے والی گوناگوں ترغیبات کو پائے استحقار کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے:-

اے مرے فقرِ غیور، فیصلہ تیرا ہے کیا؟
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک؟

برطانوی استعمار اس غیرت مند درویش کے سامنے پسپا ہوتا چلا گیا۔ افغان مُلا نے ہتھیار نہ ڈالے تو برطانوی استعمار کی سپاہ سپر انداز ہوگئی۔ چنانچہ جب سارا ایشیا سامراج کا محکوم تھا افغانستان آزاد رہا۔ نہ تو وہ ترقی کے طلسم میں گرفتار ہو کر اپنی آزادی بیچنے پر آمادہ ہو سکا اور نہ ہی تہذیب کے دام میں گرفتار ہو کر غلامی کو قبول کرنے پر تیار ہوا۔ اقبال کو اُس کی یہ سامراج دُشمن ادا بہت پیاری لگتی ہے:-

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان!
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان!
ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اُس بندے کی دہقانی پر سُلطانی قربان!

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان !

....

دُنیا میں محاسب ہے تہذیب فسوں گر کا
ہے اُس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی

....

ابلیس کو وہ فاقہ کش مسلمان اپنے سیاسی پروگرام کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں نظر آتا ہے جسے اپنے نظریات وعقائد پر استقامت اس قدر عزیز ہے کہ وہ اپنے فانی جسم و جاں اور عارضی ساز وسامان کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ چنانچہ ابلیس اپنے سیاسی فرزندوں کو مسلمانوں سے اُن کی اصل طاقت چھین لینے کے حربے اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے:-

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد ﷺ اُس کے بدن سے نکال دو!

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زیرِ نظر نظم کے ابلیس کا ہدف صرف افغان ہی نہیں بلکہ ساری کی ساری ملتِ اسلامیہ ہے۔ فاقہ کش مگر راسخ العقیدہ مسلمان دُنیا کے ہر خطے میں موجود ہے اور دُنیا کے ہر خطے کے فاقہ کش مسلمان کی سب سے بڑی قوت روحِ محمد ﷺ میں پنہاں ہے۔ دُنیائے عجم سے گزر کر دُنیائے عرب میں داخل ہوں تو ابلیس کی حکمتِ عملی موقع ومحل کے اعتبار سے ذرا سی بدلی بدلی نظر آئے گی:-

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو!

عربوں کے ہاں پہلے فرنگی تخیلات آئے اور پھر فرنگی آلات۔ عربوں نے خوشی خوشی ان تخیلات اور آلات کا استقبال کیا مگر بعد ازاں جب آنکھیں کھلیں تو پتہ چلا کہ ہمہ گیر تباہی کے یہ آلات اور ان کی نگہبان کرائے کی فرنگی سپاہ نے تو عملاً دُنیائے

عرب کی آزادی وخود مختاری کو اپنی وفاقی تعصبات کے حصار میں قید کر رکھا ہے۔ یوں اس نظم کا ابلیس اسلام کو نہ سہی عربوں کی آزادی اور خود مختاری کو دیس نکالا دے دینے میں کامیاب ہو گیا، اہلِ حرم سے اُن کی روایات چھن گئیں اور آہوِ مرغزار ختن سے نکل کر ایران اور چین کی سرحدوں کے آس پاس افغانستان میں کہیں جا سرگرمِ عمل ہوا۔

ابلیس کے سیاسی پروگرام کا چھٹا اور آخری نکتہ ہم اہلِ پاکستان کے لیے ملتِ اسلامیہ کے تمام ملکوں سے کہیں بڑھ کر خطرناک ہے۔ ابلیس نے اپنے سیاسی فرزندوں کو حکم دیا تھا کہ:۔

اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

اقبال کے کلام میں گُلِ لالہ ملتِ اسلامیہ کا استعارہ ہے۔ ابلیس اسلام کی اُس انقلابی اور حرکی روح سے حد درجہ خائف ہے جو اقبال کے نظامِ فکر میں خون کی مانند رواں ہے۔ چنانچہ وہ ملتِ اسلامیہ کی بیداری، آزادی اور خود مختاری کے امکانات کو معدوم کر دینے کا ہدف پورا کرنے کی خاطر ملتِ اسلامیہ کو اقبال کی انقلابی فکر سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔ ابلیس کے اس ہدف کو پورا کرنے کی حتمی حکمتِ عملی ہمیں اقبال کی آخری طویل نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ملتی ہے۔ اس نظم میں ابلیس جہاں اپنے درج ذیل کارناموں پر نازاں ہے کہ:۔

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

....

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں ''علمِ کلام''
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟
''ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام!''

وہاں ابلیس اپنے مشیروں کو دُنیائے اسلام میں بیداری کے اثرات سے خبردار کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ابلیسی نظام کے روشن مستقبل کے لیے اشتراکیت کوئی خطرہ نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی روح ابلیسیت کے لیے سنگین خطرات کی حامل ہے:-

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضُو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

ابلیس کو اس بات پر تو اطمینان ہے کہ دُنیائے اسلام ہنوز جمود، زوال اور خوابِ غفلت میں مست ہے مگر اُسے یہ خوف بھی ہے کہ عصرِ حاضر کے علوم کے زیرِ اثر برپا ہونے والے انقلابات کہیں مسلمانوں کو بھی بیدار کر کے اسلامی انقلاب کی شاہراہ پر نہ ڈال دیں۔ چنانچہ وہ اپنے ابلیسی نظام کو درپیش ممکنہ خطرات کو درج ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہے:-

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دِیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر ﷺ کہیں
الحذر! آئینِ پیغمبر ﷺ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!
ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

اس ممکنہ صورتِ حال میں پنہاں مستقبل کے خطرات سے نمٹنے کے لیے ابلیس نے جو حکمتِ عملی وضع کی ہے اُس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مسلمان بدستور عالمِ کردار سے دور، کارزارِ حیات سے مفرور اور خانقاہیت کے دھندلکوں میں مستور رہے تاکہ یہ ''جہانِ بے ثبات'' شیطان کے چیلوں کے تصرف میں رہے اور مسلمان تسخیرِ انفس و آفاق کے فرض سے غافل ہو کر اس طرح کے سوالات پر سر کھپاتا رہے:-

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

ہیں کلامُ اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ درج بالا سوالات کوملتِ اسلامی کے بنیادی سوالات قرار دینے والوں کوابلیس بے حد عزیز رکھتا ہے۔ یہی سوالات وہ ہتھیار ہیں جن سے ابلیس نے ملتِ اسلامی کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے۔ یہی وہ سوالات ہیں جن میں سے مختلف فرقے برآمد ہوئے ہیں۔ فرقہ آرائی ابلیس کا وہ تیر بہ ہدف نسخہ ہے جس کے استعمال سے فرقہ وارانہ انتہا پسندی اور مذہبی جنون برآمد ہوا۔ ابلیس کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ ملتِ واحدہ کے پیروکار فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہیں تا کہ:-

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اُس خدا اندیش کی تاریک رات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اقبال کی غزل سے گلِ لالہ کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اُس کی نوا سینہ سوز ہے۔ اُس کی شاعری نے ملتِ اسلامیہ میں بیداری کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو عصرِ حاضر کے مسلمان کواحتسابِ کائنات کا بھولا ہوا سبق یاد دلا رہی ہے۔ اس لیے ابلیسی نظام کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اقبال کوملتِ اسلامیہ کے چمن سے نکال دیا جائے۔ ابلیس کی حکمتِ عملی ابھی تک کامیاب جا رہی ہے۔ چنانچہ آج کی دُنیائے اسلام کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اقبال اوراُن کے جانشینوں کے انقلابی اسلامی افکار حقیقی زندگی میں جلوہ گر نہیں ہو سکے۔ ہم پاکستانیوں کے لیے یہ المیہ اور بھی زیادہ سنگین ہے کیونکہ پاکستان کا جغرافیائی وجود اقبال کی انقلابی اسلامی فکر کے آئینے میں ہی جلوہ گر

ہوا تھا مگر افسوس صد افسوس کہ ابلیس کے سیاسی فرزند اقبال کو سرکاری چمنستانوں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اشتراکی روس اور مغربی دُنیا کے درمیان سرد جنگ کے زمانے میں اگر مسلمانوں کی بیشتر حکومتوں نے اقبال کو سامراج دُشمنی اور اسلامی سوشلزم کا علمبردار سمجھ کے چمن سے نکال دیا تھا تو آج دُنیائے اسلام اور مغربی دُنیا کے درمیان کبھی سرد اور کبھی گرم جنگ کے اس زمانے میں اُسے بنیاد پرست اور انقلابی اسلام کا علمبردار ٹھہرا کر مسلمانوں کی زندگی کے اجتماعی دھارے سے کاٹ کر الگ کر دیا ہے۔

ابلیس کے سیاسی منشور کی یہ کامیابی ایک جزوی کامیابی ہے۔ مسلمان عوام اپنے حکمران طبقات سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد طرزِ فکر و اظہار رکھتے ہیں۔ مسلمان عوام میں اقبال کی انقلابی اسلامی فکر کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ نتیجہ یہ کہ مغربی استعمار کی وکالت اور چاکری میں مصروف ذرائع ابلاغ و اظہار ریڈیکل اسلام کی دُہائی دینے میں یوں مصروف ہیں جیسے ریڈیکل، ملیٹینٹ اور فنڈامینٹلسٹ کے اسمائے تحقیر کا بے دریغ استعمال مسلمان عوام کو اسلام کی حقیقی انقلابی روح سے آنکھیں چار کرنے سے روک دے گا۔ بحمد للہ ایسا ہرگز نہیں آج بھی ابلیس کے فرزندوں اور اسلام کے فرزندوں کے درمیان جنگ جاری ہے۔ فرزندانِ اسلام جنگ کے اس محاذ پر یقینِ محکم کے ساتھ سرگرمِ جہاد ہیں۔ اگر ابلیس کے فرزند، افغانوں کی غیرتِ دیں کے نگہبان اور علمبردار مُلا کو افغانستان کے کوہ و دمن سے نکال باہر کرنے میں جہد آزما ہیں تو اُن کے مقابلے میں صف آرا مجاہدین کی سب سے بڑی قوت عہدِ حاضر میں سب سے بڑے عاشقِ اسلام علامہ اقبال کی انقلابی فکر ہے:-

خودی میں ڈوب زمانے سے ناامید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے در پردہ اہتمامِ رفو!
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لا شریک لہ

نظم ’’ذوق وشوق‘‘ کو سمجھنے کے لیے

فنونِ لطیفہ میں ہنگامی اور آفاقی، وقتی اور دوامی کے پُر اسرار تخلیقی رشتوں کا سُراغ پانے کے لیے اقبال کی نظم ’’ذوق وشوق‘‘ کا مطالعہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ نظم کا پہلا مصرع ہی اس بات کا اعلان ہے کہ اس نظم کا موضوع ’’قلب ونظر کی زندگی ہے۔‘‘ ہر چند آفاقی جذبات اور دوامی حقائق کسی مقامی اور وقتی حوالے سے بے نیاز ہوا کرتے ہیں تاہم انھیں اپنے زمانی ومکانی تناظر میں سمجھنے کی ایک اپنی الگ اہمیت ہے۔ یہ نظم ایک دلکش اور خیال انگیز منظر سے شروع ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک نعتیہ فریاد پر آ تمام ہوتی ہے۔ یہ منظر پردۂ وجود کے چاک چاک ہو جانے کی بدولت حسنِ ازل کی بے حجابی اور قلب ونظر میں صبح کے سماں سے عبارت ہے۔ گویا باطنی زندگی میں طلوعِ آفتاب سے گرد وپیش کی زندگی کے تمام تر خارجی مناظر نور کی ندیوں میں ڈوب کر کہیں دور، بہت دور غائب سے ہوگئے ہیں۔ اس نورانی منظر میں نواح کاظمہ کا ریگِ زار اور کوہِ اضم کا شفق زار یک بہ یک تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے اور شاعر دیکھنے اور سوچنے لگتا ہے:۔

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں؟

تخیلِ اقبال کو ان گزرے ہوئے کاروانوں کا تعاقب کرتے کرتے زمانِ مصطفٰی میں لے جاتا ہے اور وہ یوں محسوس کرنے لگتے ہیں جیسے چند ہی ثانیوں میں وہ

مدینۃ النبی میں پہنچنے والے ہیں۔ ایسے میں:-

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

چنانچہ اقبال کے تخیل کا رہوار وہیں کا وہیں رُک جاتا ہے اور اقبال خیال ہی خیال میں آنحضور ﷺ کے سامنے اپنا دِل کھول کر رکھ دیتے ہیں:-

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات
ذکرِ عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

یہ گویا اپنے زمانے کی ملتِ اسلامی کا تنقیدی محاکمہ ہے۔ ان اشعار پر اگر ان کے تاریخی تناظر میں غور کیا جائے تو ان کا مفہوم بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اقبال پر یہ نظم سن ۱۹۳۱ء میں قیامِ فلسطین کے دوران وارد ہونا شروع ہوئی تھی۔ اقبال فلسطین میں براستہ لندن پہنچے تھے۔ لندن میں وہ دوسری گول میز کانفرنس (۷ ستمبر تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء) میں مسلمان مندوب کی حیثیت میں شریک ہوئے تھے۔ یہ کانفرنس مستقبل کے آزاد ہندوستان کے لیے ایک وفاقی آئینی ڈھانچہ تعمیر کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ کم و بیش ایک سال پہلے اقبال اپنے خطبہ الہ آباد میں برصغیر ہند کے لیے زیرِ غور وفاقی آئین کے تصور کو رد کر کے برصغیر میں جداگانہ مسلمان مملکتوں کے قیام کا تصور پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ اس گول میز کانفرنس میں شامل بیشتر مسلمان مندوبین کا سرکار پرست اور برطانیہ نواز رویہ بھانپ کر وہ کانفرنس کا

بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔[۱] مسلمان مندوبین کی ابن الوقتی کو سمجھنے کے لیے اقبال کے دو خطوط بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن میں سے ایک سر آغا خان کے نام ہے اور دوسرا سیٹھ عبداللہ ہارون کے نام۔ سر آغا خان کے نام اپنے خط میں اقبال کانفرنس سے بائیکاٹ کا سبب بتاتے ہیں:-

"It is with the greatest pain that I am writing this letter to you. I have watched the activities of our Muslim Delegation from the very beginning. Their secret rivarlies, the intrigues or even disloyalty of some of the members have pained me very much. Disgusted with such behaviour I am extremely sorry to inform you that from today I shall have nothing to do with what must be described as a shadow cabinet of the Muslim Delegation."[۲]

سیٹھ عبداللہ ہارون کے نام اپنے خط مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۳۲ء کو مسلمان سیاسی رہنماؤں پر اپنے عدمِ اعتماد کا اظہار کرتے وقت اقبال اپنے لہجے کی تلخی کو چھپانے میں ناکام نظر آتے ہیں:-

"Thanks for your letter which I received a moment ago. I am sorry to tell you that I felt extremely pessimistic about Muslim demands in England and that state of mind still continues. Experience has

taught me that very few men should be trusted.

As to your proposed deputation I do not wish to say anything for the present. As you know I shall be presiding over the deliberations of the coming conference at Lahore. I must, I think, reserve my views as to what the Muslims of India should do now that their demands have received practically no attention from the Premier."(۳)

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے مذکورہ بالا خطبۂ صدارت میں برطانوی وزیراعظم کی ہندوستانی زندگی کے حقائق سے ناآشنائی کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا اور گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین کی سرکار پرستی کو بھی۔ انھوں نے اسلامیانِ ہند کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہر دو فریق کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ کر ایک آزاد راستے کا انتخاب کریں۔ یہ وہی راستہ ہے جس کی نشاندہی وہ کم و بیش ایک سال پہلے اپنے خطبۂ الہ آباد میں کر چکے تھے۔ یہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں جداگانہ مسلمان مملکتوں کے قیام کی راہ تھی۔

گول میز کانفرنس کے بعد انھیں مؤتمر عالم اسلامی کے فلسطین میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ چنانچہ وہ فرانس میں برگساں اور لوئی مسینیوں اور اٹلی میں مسولینی اور افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ خان سے ملاقات کے بعد ۶/ دسمبر کو بیت المقدس پہنچ گئے۔ گول میز کانفرنس کی طرح مؤتمر عالم اسلامی کی کانفرنس سے بھی وہ کانفرنس کے اختتام سے پہلے ہی ۱۵/ دسمبر کو واپس چلے

آئے۔ اس ۹ روزہ قیام کے دوران انھوں نے فلسطین کی سیر کے ساتھ ساتھ مؤتمر کے اجلاسوں میں مسلمان ملکوں کے حکمران طبقے کے اعلیٰ ترین نمائندوں سے ملاقات کی اور روانگی سے ایک روز پیشتر کانفرنس سے انگریزی میں خطاب کیا۔ اپنے خطاب میں جہاں انھوں نے ملتِ اسلامی کو درپیش خطرات کی نشاندہی کی وہاں انھوں نے دُنیائے اسلام کے سیاسی اور تہذیبی رہنماؤں کو دِل سے مسلمان بننے کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے خبردار کیا کہ:۔

"اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک الحاد مادی کی طرف سے ہے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روح طاہران دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بری چیز نہیں ہے، لیکن اگر اس میں خاص اعتدال کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط وتفریط پیدا ہو جائے تو اس میں بھی دہریت اور مادہ پرستی پیدا کر دینے کے امکانات موجود ہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ نہیں ہے لیکن خود مسلمانوں سے مجھے اندیشہ ہے۔ میں تو جب بھی سوچتا ہوں شرم وندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم پر فخر کریں؟ ہاں! جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے جو رسول اللہ ﷺ نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہوسکیں گے کہ حضور ﷺ ہم پر فخر کریں۔" (۴)

اقبال کی اس گفتگو کی روشنی میں اگر ہم اوپر دیئے گئے اشعار کو ایک مرتبہ پھر پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نظم کا فوری محرک وہ گہری مایوسی ہے جس نے لندن کی گول میز کانفرنس اور مؤتمر عالمِ اسلامی کے اجلاس کے دوران اقبال کو اپنی گرفت میں لے لیا

تھا۔ یہاں اقبال کو دُنیائے اسلام کے سیاسی زعماء، علمائے دین اور دانشوران کرام سے بالمشافہ ملاقاتوں اور موتمر کے اجلاسوں میں اُن کے طرزِ فکر و اظہار سے براہِ راست شناسائی کا موقع ملا تھا۔ یہاں کی باتیں اور ملاقاتیں اُن کے لیے مایوس کن ثابت ہوئی تھیں۔ چنانچہ اُن کی تمام تر تخلیقی شخصیت ایک مقدس بے چینی سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ احساس کہ دجلہ و فرات کے کنارے حق و باطل کے درمیان صف آرائی جوں کی توں موجود ہے مگر قافلۂ حجاز میں کوئی حسینؓ نظر نہیں آتا۔ یوں کہیے کہ مسلمان حکمرانوں میں ایک سے ایک بڑھ کر شاہ حسین تو موجود ہے مگر امام حسینؓ بننے کو کوئی بھی تیار نہیں۔ علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین کا حال حکمرانوں سے بھی بدتر ہے۔ عشق کی آگ بجھ چکی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی خاکستر یہاں وہاں اُڑتی پھرتی ہے اور شرع و دین خیالات کا بت کدہ بن کر رہ گئے ہیں:-

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

موتمر سے اپنے الوداعی خطاب کی مانند اس نظم میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ ملتِ اسلامی اس وقت جس تہ در تہ تاریکی میں پڑی اونگھتی ہے اُسے صرف عشق ہی کی روشنی سے منور کیا جا سکتا ہے۔ اس جدوجہد کا آغاز اہلِ حرم کے سومنات .... خود مسلمانوں کے بت کدۂ تصورات کی تخریب و تباہی کے بغیر ناممکن ہے۔ چنانچہ اقبال کے دل سے یہ سوال اُٹھتا ہے کہ:-

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

یہ احساس کہ اقبال کے عہد کا ''مسلمان اس قابل نہیں کہ رسول کریم ﷺ اس پر فخر کر سکیں۔'' اقبال کو بصد عجز و ندامت بارگاہِ مصطفیٰ میں لے جاتا ہے اور یوں نظم

کا باقی ماندہ حصہ آنحضور ﷺ سے راز و نیاز بن کر رہ جاتا ہے۔ ماضی مستقبل بننے کو بے چین ہو جاتا ہے:-

تازہ مرے وجود میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

اس نظم کے فوری محرکات کی تلاش میں نکلیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دُنیائے اسلام کا حکمران طبقہ ابولہب کی پرستاری پر نازاں ہے۔ ایک فارسی نظم میں اقبال نے عرب و عجم ہر دو خطہ ہائے زمین میں ابولہب کو ارزاں اور مصطفیٰ کو نایاب بتایا ہے۔ اپنی نظم ''انقلاب اے انقلاب'' میں وہ دنیائے اسلام کو خبردار کرتے ہیں کہ:-

در کلیسا ابن مریم را بدار آویختند
مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کرد باأم الکتاب
انقلاب!
انقلاب ، اے انقلاب!

نظم ''ذوق وشوق'' محمد مصطفیٰ ﷺ کی تلاش کی دین ہے۔ اس تلاش کا نقطۂ آغاز مسلمانوں کے سیاسی اور دینی بتکدوں پر غزنوی بن کر ٹوٹ پڑنے سے عبارت ہے۔ اقبال کی نظر میں مؤتمر عالم اسلامی بھی ایک ایسا ہی بتکدہ ہے۔ جب دوسری مرتبہ اقبال کو مؤتمر کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے یہ سوچ کر اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ تو فرنگی سامراج ہی کا ایک ادارہ ہے۔ مؤتمر کے استعماری کردار کی یہ بات بیشتر مسلمانوں کو ناقابلِ یقین نظر آئے گی۔ اس لیے میں یہاں ڈاکٹر تاثیر کی ایک تحریر سے ایک طویل اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں:-

''جس ملاقات کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ایک اور بات بھی جو قابل ذکر ہے ہوئی تھی اس کا تعلق سیاسیات سے بھی ہے اور علامہ اقبال کی اپنی ذات سے بھی۔ ڈاکٹر صاحب کو آکسفورڈ سے روڈز لیکچر دینے کی دعوت آئی۔ میں ان دنوں کیمرج میں تھا اور ڈاکٹر

صاحب کو اصرار سے لکھا کہ وہ اس دعوت کو رد نہ فرمائیں۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ان کا سفر انگلستان سیاسی حیثیت رکھتا تھا۔ روڈز لیکچر کی علمی حیثیت تھی۔ انگلستان کے ادیب اور اہل علم لوگوں نے زمان و مکان کے مسئلے کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں معلوم کرنا چاہا۔ ڈاکٹر صاحب نے زمان و مکان کے اسلامی تصور پر لیکچر دینے کا ارادہ کرلیا تھا۔ میں نے انگلستان کے ادبی حلقوں میں ان لیکچروں کا پہلے سے چرچا کر رکھا تھا۔ ذاتی اور قومی فخر کے ساتھ اقبال کے ادبی مرتبہ کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک خط میں یقین دلایا کہ میں ضرور آؤں گا لیکن یکا یک ان کا ایک اور خط آیا اور اس میں لکھا کہ انھوں نے ارادہ منسوخ کردیا ہے۔ مجھے اس کا بہت رنج ہوا۔ اس ملاقات میں وہ راز بھی منکشف ہوا۔ روڈز لیکچر کی دعوت لارڈ لوتھین کے ذریعے آئی تھی۔ لارڈ لوتھین علامہ کا بہت مداح تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے کیمرج میں ایک ملاقات کے دوران میں مجھ سے کہا تھا: ''عالم اسلام ہی میں نہیں، تمام مشرق میں اقبال جیسا اثر انداز مفکر اور کوئی نہیں۔'' یہ بھی کہا کہ: ''اقبال کے افکار تاریخ عالم کا رُخ بدل دیں گے سیاسی لوگ نہیں جانتے کہ اقبال کی طرح کے شاعر کس قدر مؤثر ہو سکتے ہیں۔'' اسی لوتھین نے علامہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ فلسطین آ کر مؤتمر اسلامی میں شریک ہوں اور اسلامی ممالک تک اپنا پیغام پہنچائیں۔ بظاہر یہ اچھی بات تھی۔ علامہ اقبال نے وعدہ کرلیا لیکن انھیں بہت جلد اس کا احساس ہوگیا کہ یہ مؤتمر برطانوی سامراج کی کرشمہ سازی کا نتیجہ تھی۔ اقبال برطانوی سامراج کا سخت دشمن تھا۔ روڈز لیکچر اور اس مؤتمر کی تاریخیں پاس پاس تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مروت کے پتلے تھے۔ وعدہ بھی کر رکھا تھا

کہ ممکن ہوا تو مؤتمر میں شریک ہوں گے۔ مؤتمر سے بچنے کا یہی طریقہ نظر آیا کہ آکسفورڈ نہ جائیں۔''(۵)

جناب حمزہ فاروقی نے اپنی کتاب ''سفر نامۂ اقبال'' میں اس بات کا انکشاف بھی فرمایا ہے کہ عرب نوجوانوں میں مؤتمر کے انعقاد کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کے نمائندے بھی اس کے ممکنہ نتائج سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ میں جب ایک رکن نے اپنی تقریر میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ مجوزہ کانفرنس میں مسلمان مندوبین کی تقریروں سے ''یہود و نصاریٰ کے خلاف مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہوں گے۔'' تو وزیر نوآبادیات سر رابرٹ ہیملٹن نے جواب دیا تھا کہ:-

''مجھے اس قسم کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے جذبات مشتعل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہائی کمشنر سے تحقیقات کرنے پر مجھے علم ہوا ہے کہ مفتی اعظم کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور وہ کانگرس کی کارروائی ایسے طریق پر انجام دیں گے کہ برطانوی یا فلسطین کی حکومت کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''(۶)

مؤتمر کی افسردہ و مردہ قراردادوں سے بھی اس حقیقت کا سُراغ ملتا ہے کہ آج ہی نہیں بلکہ اپنے آغاز میں بھی یہ مؤتمر ایسی ہی بے جان اور پُرفریب تنظیم تھی۔ ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن کے عکس پر ینگ مین مسلم ایسوسی ایشنوں کے قیام سے لے کر جدید عربی لغت کی تیاری اور حجاز ریلوے تک اس کی قراردادوں میں کہیں بھی عشق کی آنچ محسوس نہیں ہوتی۔ اقبال نے بہت اچھا کیا کہ کانفرنس کی تکمیل سے پہلے ہی مندوبین کو اپنی آستینوں میں چھپائے ہوئے بتوں کو توڑنے کا مشورہ دے کر لاہور واپس آ گئے۔ یہ ہے وہ تاریخی، سیاسی اور تہذیبی تناظر جس کے بغیر ''ذوق وشوق'' کی تفہیم و تحسین ناممکن ہے۔

جو لوگ مسلمان ممالک میں سیاہ وسفید کے مالک ہیں اُن میں سے کچھ جان

بوجھ کر اور کچھ بے جانے بوجھے مغربی سامراج کے سیاسی آلۂ کار بنے بیٹھے ہیں۔ ایسے میں اقبال کی اُمیدوں کا مرکز وہ مسلمان نوجوان ہیں جن کا ذکر انھوں نے مؤتمر سے اپنے الوداعی خطاب میں رجائیت کے ساتھ کیا ہے اور جنھیں نظم ''ذوق و شوق'' میں ''ذرۂ ریگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اپنے زمانے کی دُنیائے اسلام کی بے آب وگیاہ، بنجر اور تہ در تہ تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی خارجی زندگی سے دلبرداشتہ ہو کر اقبال ''قلب ونظر کی زندگی'' کا رُخ کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے غلام ماضی کی صدیوں کو پھلانگتے ہوئے واپس اسلام کے قرنِ اول میں جا پہنچتے ہیں اور رسول اکرم ﷺ کے حضور عرض گزارتے ہیں:۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر گردشِ آفتاب سے!

....

حواشی

(۱) بحوالہ خطبہ صدارت کل ہند مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۳۲ء۔

(۲) لطیف احمد شروانی (ایڈیٹر)، Letters and Writings of Iqbal، لاہور، ۱۹۸۱ء، (ص ۸۔۹)

(۳) ایضاً (ص ۹۔۱۰)

(۴) حمزہ فاروقی، سفرنامۂ اقبال، اقبال اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۲۔

(۵) ڈاکٹر تاثیر، اقبال کے حضور، رسالہ فنون، ۲۱ (جون ۱۹۷۵ء)، ص ۱۔۲۔

(۶) حمزہ فاروقی، سفرنامۂ اقبال، اقبال اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۸۔

اقبال، اسلام اور مذاہبِ فقہ

آج کل فرقہ واریت کا عفریت ہمارے قومی وملی وجود کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دینے کے درپے ہے۔ مذہب کے نام پر اس دہشت گردی کے اسباب پر غور کریں تو اپنے حکمران طبقے کی فرعونی سیاست کے خدوخال کے ساتھ ساتھ عالمی طاقتوں کی ابلیسی چال ڈھال کے ان گنت بھیانک روپ سامنے آتے ہیں مگر فی الوقت مجھے فرقہ واریت کے اسباب کا کھوج لگانے سے زیادہ اس کے خوفناک نتائج سے سروکار ہے۔ فرقہ واریت کے سنگین نتائج کا خیال کرتا ہوں تو مجھے علامہ اقبالؒ یاد آتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے مشہور مقالہ ''اسلام بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی مسلک'' میں ہمیں فرقہ آرائی کے خطرات سے خبردار کیا تھا۔ اپنے اس مقالہ میں انہوں نے اسلام کے روحانی اصولوں کی دائمی صداقت پر عہد جدید کے تقاضوں کی روشنی میں فلسفیانہ بحث کی ہے۔ زندگی کے روحانی اور سیاسی ہر دو دائروں میں آزادی وجمہوریت اور اخوت ومساوات کے اصول واقدار کی کارفرمائی کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا امتیازی نشان ثابت کرنے کے بعد اپنے مقالہ کی آخری سطروں میں اقبال نے ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جو نوے (۹۰) برس گزرنے اور قیام پاکستان کے نصف صدی بعد آج بھی ہم سے جواب طلب ہے۔ مصور پاکستان آج ایک مرتبہ پھر ہم سے پوچھتے ہیں کہ:-

''کیا ہم مسلمان اپنی سوشل اکانومی میں ان اصول واقدار پر

صدق دل کے ساتھ عمل پیرا ہیں؟ کیا اس سرزمین پر اسلام کا بنیادی اتحاد قائم ہے؟ مذہبی طالع آزماؤں نے مختلف فرقے اور برادریاں قائم کر لی ہیں جو ہر وقت ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی ہیں۔ پھر ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ہم نے خود کو چھوٹی اور بڑی ذات برادریوں میں منقسم کر رکھا ہے۔ یقیناً اس معاملے میں ہم نے ہندوؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ہم تو ذات پات کے دُہرے نظام کی پیروی کرنے لگے ہیں۔ معاشرتی ذات پات کے نظام کے ساتھ ساتھ ہم نے مذہبی ذات پات اور چھوت چھات کا نظام بھی وضع کر لیا ہے۔ جو ہم نے یا تو ہندوؤں سے ورثہ میں لیا ہے یا ان سے سیکھ لیا ہے۔ میں مذہبی اور معاشرتی فرقہ واریت کے لعنتی نظام کی مذمت کرتا ہوں۔ میں خدا کے نام پر اس کی مذمت کرتا ہوں۔ خدا کا آخری پیغام انسانیت کی آزادی اور مساوات کا پیغام ہے۔ اسلام ایک ہے۔ اسلام ناقابل تقسیم ہے۔ اسلام میں وہابی شیعہ سنی وغیرہ کے الگ الگ وجود کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب خود حقیقت کا وجود ہی خطرے میں پڑ چکا ہو تب حقیقت کی مختلف تفسیروں اور تعبیروں پر جھگڑنا کہاں کی عقلمندی ہے؟''

ہندی مسلمانوں میں نسلی اور مذہبی ذات پات اور چھوت چھات کے اسی دُہرے نظام کی تردید اقبال کی مقبول عام نظم ''جواب شکوہ'' میں بھی بڑے موثر انداز میں ملتی ہے۔ متذکرہ بالا مضمون کی اشاعت کے صرف چند برس بعد منظر عام پر آنے والی اس نظم میں خود اللہ تعالیٰ اس غیر اسلامی فرقہ وارانہ روش پر مسلمانوں کا احتساب درج ذیل پیرایہ بیان میں فرماتے ہیں:-

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

امت مسلمہ کے روحانی اور مادی زوال کا بنیادی سبب فرقہ بندی اور ذات پات کا نظام ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی اصل روح سے روگردانی کرتے ہوئے نسلی برتری اور خونی رشتوں کے تقدس کے جاہلانہ تصورات کو اپنا لیا ہے۔ یوں اُن کی قومی اور ملی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اقبال اس طرز عمل کو ابولہب کی پیروی قرار دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں عہد حاضر کی دنیائے اسلام ابولہب کی پرستار ہے:

در عرب گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب

حق فراموشی اور باطل پرستی کی اس فضاء میں اللہ میاں مسلمانوں کی یوں سرزنش فرماتے ہیں:

کون ہے تارک آئین رسول ﷺ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہوگئی کس کی نگاہ طرز سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمد ﷺ کا تجھے پاس نہیں

اقبال کو بارگاہِ ایزدی سے اپنے شکوہ کا جواب یہ ملا کہ مسلمانوں میں دولتِ دل اور دولتِ دنیا ہر دو کے نایاب ہو کر رہ جانے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انہوں نے پیغام

محمد ﷺ پر عمل کرنے کی بجائے اسلام کے نام پر ابولہب کی پیروی کا چلن اختیار کر رکھا ہے۔ مسلمان جب ایک مرتبہ پھر وطنی قومیت کی حدود اور مذاہب فقہ کی قیود سے اپر اٹھ کر بارگاہِ رسالتمآب میں سرِ تسلیم خم کر لیں گے تب ان کا مادی اور روحانی زوال عروج میں بدل جائے گا۔ اللہ کی رحمتوں سے فیض یاب ہونے کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ:-

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

تمام مذاہب فقہ کا مشترک سرچشمہ، فیضان قرآن حکیم اور آنحضور ﷺ کی ذات والا صفات ہے جنہیں حریم کبریا سے ایک دین کی اشاعت اور واحد امت کی تشکیل کا بار امانت سونپا گیا تھا۔ مسلمانوں نے آئین رسول ﷺ کو کب اور کیوں ترک کیا؟ اقبال مسلمانوں پر ملوکیت کے تسلط کو اس انحراف کا نکتہ آغاز قرار دیتے ہیں۔ مسلمان حکمرانوں نے جب ایک مرتبہ اسلام کا نظام سیاست وحکومت ترک کر کے دورِ جاہلیت کے نظام سیاست وحکومت کو اختیار کر لیا تو پھر قدرتی طور پر ظہورِ اسلام سے پہلے کے جاہلی رسوم ورواج نے مسلمانوں کے اندر پھر سے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ:-

منزل و مقصود قرآں دیگرے
رسم و آئینِ مسلماں دیگرے

....

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہال سلطنت قوت گرفت
دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

ایسے میں اقبال اسلام کی ابتدائی پاکیزگی اور حقیقی روح کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ملوکیت اور ملائیت کی تردید کرتے ہوئے نوجوان نسل کو حقیقی اسلام کی بازیافت کا فریضہ یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں کل ہند و مسلم کانفرنس میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران انہوں نے کہا تھا کہ:-

''تم اپنے اندر جو اعتقاد رکھتے ہو، وہ فرد کی اہمیت کا قائل ہے اور اس چیز کے لیے ساعی ہے کہ تم خدا اور انسان کی خدمت کر سکو۔ اس کے امکانات ابھی پوری طرح وجود میں نہیں آئے۔ وہ اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں ذات، رنگ یا دولت کے پیمانہ سے اس کی عظمت کو ناپا نہیں جاتا بلکہ اس کی طرز زندگی سے جہاں غریب امیروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں۔ جہاں انسانی سوسائٹی شکم کی مساوات پر نہیں، بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔ جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی کو عقد میں لا سکتا ہو۔ جہاں ذاتی ملکیت ایک امانت ہو۔ جہاں اس طور پر ارتکازِ دولت کا امکان نہ ہو کہ وہ دولت پیدا کرنے والے پر ہی چھا جائے لیکن تمہارے عقیدہ کا یہ معراج نشاۃ وسطیٰ کے فقیہوں کے نازک خیالیوں سے پاک ہو جانا چاہیے۔ روحانی طور پر ہم ان تخیلات اور احساسات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جو ہم نے پچھلی صدیوں کے دوران میں اپنے گرد لپیٹ لی ہیں''۔

اقبال کے نزدیک اسلام کو قرونِ وسطیٰ کے فقہاء اور ماہرین قانون کی تاویلات کے پھندوں سے آزاد کرانا اسلامی نظام کی نئی تشکیل کی جانب پہلا قدم ہے۔ مسلمانوں کے دور ملوکیت کے استبدادی سیاسی نظام کی جبر و اکراہ کی فضاء میں ہمارے دینی پیشواؤں نے اسلامی تصورِ حیات کو جس جس انداز میں عہد بہ عہد پیش کیا ہے وہ شہنشاہیت کی اٹل حقیقت سے سمجھوتے کی مختلف صورتیں ہیں۔ بادشاہوں نے

اپنے غیر اسلامی، شاہانہ طرزِ زندگی کے فروغ اور اپنی سلطنت کے استحکام کی خاطر قیصر وکسریٰ کے چلن کو مشرف بہ اسلام کرنے کی خاطر ملائیت کا ادارہ ایجاد کیا۔ ملوکیت اور ملائیت ایک دوسرے کے دست و بازو بن گئے اور دونوں نے مل کر ملت کی وحدت کو باہم متحارب فرقوں میں بانٹ دیا۔ عہدِ جدید تک آتے آتے دنیائے اسلام کا منظر کچھ یوں ہو گیا:۔

دینِ حق از کافری رسواتر است
زانکہ ملا مومن کافر گر است!
شبنم مادر نگاہِ او یم است
از نگاہِ او یم ما شبنم است!
از شگر فیہائے آں قرآں فروش
دیدہ ام روح الامیں را در خروش!
زانسوائے گردوں دلش بیگانہ
نزدِ او ام الکتاب افسانہ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی ﷺ
آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد
ملت از قال و اقولش فرد فرد!
مکتب و ملا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب!
دینِ کافر فکر و تدبیر جہاد
دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد!

اسلام کے نام پر فتنہ وفساد کی فرقہ وارانہ فضا نے اسلام بمقابلہ مذاہب فقہ کی وہ ناپسندیدہ صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ آج ہمارے ہاں نفاذِ اسلام کی بجائے

اپنے اپنے مذہب فقہ کے نفاذ کا شور وغل مچ رہا ہے۔ فرقہ وارانہ تشدد کے ہاتھوں دنیائے اسلام کا شیرازہ بکھر جانے کے ان ہی امکانات کو پیش از وقت بھانپ کر اقبال نے ان زنجیروں کو توڑ پھینکنے کی تمنا کی تھی جو مسلمانوں کے دورِ ملوکیت و استبداد کے دوران دین اسلام کو پہنائی گئی تھیں۔ پاکستان کا تصور بھی اسی تمنا کی کرشمہ سازی ہے۔ عرب شہنشاہیت کے ناپاک اثرات سے اسلام کو پاک کر دینے کی یہ دعوت تصور پاکستان کا جزو لاینفک ہے۔

اقبال نے برصغیر میں اسلام کے وجود کو خطرات سے بچانے کی تمنا میں جداگانہ مسلمان مملکتوں کے قیام کا تصور پیش کیا تھا۔ ہماری سیاسی اور تہذیبی جدوجہد کی اس اہم ترین دستاویز میں اقبال نے پاکستان کے قیام کے امکان کو اسلامیان ہند کے ساتھ ساتھ خود اسلام کے حق میں بھی ایک نیک فال قرار دیا تھا۔ اقبال نے فرمایا تھا کہ پاکستان کے قیام سے اسلام کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ اس سے عرب شہنشاہیت کی چھاپ اتاری جا سکے گی اور یوں اسلام کے کلچر، قانون اور تعلیم کو اسلام کی حقیقی روح کے مطابق حرکت دی جائے گی۔ صدیوں کا جمود ٹوٹے گا۔ اسلام کی حقیقی روح کی بازیافت ہوگی اور پھر اسلام کی اس حقیقی روح کو روحِ عصر سے ہم آہنگ کر کے ایک جہانِ نو تخلیق کیا جا سکے گا۔

افسوس کہ پاکستان میں عرب شہنشاہیت کی یہ چھاپ صرف مذہب پر ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر نہ صرف موجود ہے بلکہ اور گہری ہوگئی ہے۔ اسلام نے لاقیصر ولاکسریٰ کہہ کر خاندانی شہنشاہیت کے نظام کی نفی کر دی تھی اور اس کی جگہ سلطانی جمہور کے نظام کی تلاش شروع ہوگئی تھی۔ حریت و مساوات کا خواب حقیقت کا روپ دھارنے لگا تھا مگر بنوامیہ نے قیصر و کسریٰ کی خاندانی شہنشاہیت کے عکس پر عرب ملوکیت کا نظام قائم کر دیا۔ اس غیر اسلامی نظام کو مشرف بہ اسلام کرنے کی خاطر دینی تاویلات کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اسلام کی مختلف اور متصادم تفسیر و تعبیر نے مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیا۔ یہ مذہبی نزاعات دراصل شہنشاہیت کا کڑوا

پھل ہیں۔ اس زہر کا تریاق اصل حقیقت یعنی اسلام کی تفسیر و تعبیر پر جھگڑنے کی بجائے علمی روایات کی روشنی میں ہر کسی کو تفسیر و تعبیر کی آزادی کا حق دینا ہے۔ اختلاف رائے کو اپنے معاشرے کے لیے خیر و برکت بنانا ہے نہ کہ فتنہ و فساد کی چنگاری۔

اقبال کے نزدیک فرقہ وارانہ کشیدگی اور تصادم مذہبی دیوانگی کا نہیں بلکہ سامراجی حکمتِ عملی کا شاخسانہ ہے۔ سادہ لوح مسلمانوں کے جو گروہ آئے دن اس آگ کا ایندھن بنتے رہتے ہیں وہ ''صید ملایان و نخچیر ملوک'' ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں ابلیس کے سیاسی کردار کو منفرد اور متنوع پیرایوں میں اجاگر کر رکھا ہے۔ اس ضمن میں ان کا آخری شاہکار ان کی نیم ڈرامائی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہے۔ دنیا میں ابلیسی نظام کو درپیش خطرات کی تفہیم اور پیش بندی کی خاطر ۱۹۳۶ء میں ایک خیالی عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ اپنے اختتامی کلمات میں ابلیس اپنے مشیروں کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اشتراکیت کی بجائے اسلام کو اپنے عالمی نظام کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیتا ہے۔ ابلیس اس خطرے سے ہرگز غافل نہیں ہے۔ پیش بندی کے طور پر اس نے پہلے ہی متعدد موثر اقدامات کر رکھے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے مشیروں کے سامنے اپنی جنگی حکمتِ عملی پر اعتماد کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بات ابلیس کے لیے باعث مسرت و اطمینان ہے کہ دنیا کے مسلمان اپنے دین کی انقلابی روح سے غافل اور فقط رسمی عبادات پر قانع ہو کر ابلیسی نظام کو مستحکم سے مستحکم تر ہونے کا موقع فراہم کرتے چلے آ رہے ہیں۔

یہ بات ابلیس کے لیے بے حد خوش آئندہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں نے بڑے صدق دل کے ساتھ امتِ مسلمہ کو قرآن کی تفہیم و تعبیر کے ذرا ذرا سے اختلاف کی بنیاد پر باہم متحارب فرقوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ فرقہ آرائی دنیا میں شیطنت کے فروغ و استحکام کے لیے بے حد سازگار ہے۔ اس لیے اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے:-

خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

خدا اندیش مسلمان کی رات کو تاریک سے تاریک تر کرنے، اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات کو بدستور چھپائے رکھنے اور اسے عالم کردار سے بیگانہ رکھنے کا موثر ترین ذریعہ زندگی گریز منطقی موشگافیوں پر فرقہ وارانہ جنگ وجدل ہے۔ دور ملوکیت میں اس طرح کے سراسر نظری مسائل کو ہوا دے کر مسلمانوں کی توجہ زندگی کے ٹھوس حقائق سے ہٹا دی گئی تھی۔ ابلیس کا مشن یہ ہے کہ عصر رواں میں بھی مسلمان ایسے ہی لفظی گورکھ دھندوں میں بدستور الجھے رہیں، مذاہب فقہ کی دیواریں اس قدر اونچی اٹھا دی جائیں کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہی حد بندی کے اندر محدود ہو کر الہیات سے تراشے ہوئے لات و منات کی پرستش میں مصروف رہے۔ ابلیس کو جہاں اپنی اس حکمت عملی کے کارگر ہونے کا یقین ہے وہاں اسے دنیائے اسلام کے گردو پیش رونما ہونے والے انقلابات پر تشویش بھی ہے۔ اسے اندیشہ ہے کہ ان انقلابات کے زیر اثر کہیں مسلمان ملوکیتی اسلام کی تنگ و تاریک فضاؤں سے نکل کر حقیقی اسلام کی وسیع نورانی فضاؤں میں نہ آ نکلیں۔ چنانچہ وہ اپنے مشیروں کو اپنے نظام کے لیے اس سنگین خطرے کا احساس دلاتا ہے۔

آج سے چونسٹھ برس پیشتر اقبال نے اپنی اس نظم میں ابلیس کا جو سیاسی منشور بے نقاب کیا تھا ہم آج تک اسی منشور کے حرف و معنی پر عمل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے ابلیس کے پروگرام کو کچھ یوں مشرف بہ اسلام کر لیا ہے کہ مسلمانوں کی بیداری اور اتحاد سے لرزاں و ترساں مغربی دنیا عہد بہ عہد سکھ کا سانس لیتی چلی آ رہی

ہے۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمہ پر جو نیا عالمی نظام قائم ہوا تھا اس کے آقاؤں کو سب سے بڑا خطرہ دنیائے اسلام کی بیداری اور حقیقی اسلام کے نفاذ ہی سے تھا۔ چنانچہ آرنلڈ۔ جے۔ ٹوائن۔ بی نے ۱۹۴۸ء میں "Islam,the west,and the future" کے عنوان سے اپنے خیالات کو یوں سمیٹا ہے:

"ہر چند پان اسلامزم محوِ خواب ہے تاہم اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ سونے والا بیدار بھی ہو سکتا ہے۔ اگر مغربی علوم میں تربیت یافتہ مسلمانوں نے مغربی بالادستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دی اور مغرب مخالف جدید قیادت کے پیچھے صف بستہ ہو گئے تو پھر انقلابی اسلام نیند کو جھٹک کر بیدار ہو جائے گا اور ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا تاریخی کردار سر انجام دینے لگے گا۔ یہ صورت حال دنیائے مغرب کے لیے انتہائی سنگین ہو جائے گی"۔

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ مسلمانوں کی بیداری اور دنیائے اسلام کے ممکنہ اتحادِ فکر و عمل سے اقبال کے ابلیس کو جو خطرہ درپیش ہے آرنلڈ ٹائن بی بھی مغربی دنیا کے مستقبل کو اسی خطرے سے دوچار پاتے ہیں۔ مغربی دنیا کے مورخ اور مفکر بھی اسی تشویش میں مبتلا ہیں جس میں اقبال کا ابلیس مبتلا ہے:۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں\
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

پروفیسر ٹائن بی کو اس امر پر اطمینان ہے کہ اسلام کی حقیقی روح ابھی تک سو رہی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اسے اس امکان پر تشویش بھی ہے کہ اگر اسلام کی حرکی روح جاگ اٹھی تو پھر دنیا پر مغربی بالادستی کا مستقبل تاریک ہو کر رہ جائے گا۔ اس ضمن میں انہیں سب سے بڑا خطرہ اسلام کی انقلابی روح کے متلاشی جدید مسلمان سے ہے۔ ان کی نظر میں اس خطرے کا تدارک قدامت پرستی، تقلید پسندی اور جدت بیزاری کے رجحانات کو ہوا دینے اور صوفی وملا کو اس جدید مسلمان کے خلاف صف آرا

کر دینے سے ممکن ہے چنانچہ فرقہ وارانہ تصادم سے مسلمانوں کو اتفاق کی شاہراہ سے ہٹا کر نفاق کی اندھی گلیوں میں بھٹکا دینا اسی اندرونی صف آرائی کی ایک بھیانک شکل ہے۔ اس باب میں اقبال کا ابلیس پروفیسر ٹائن بی سے متفق ہے:۔

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر، اسی میں ہے رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

روس کی اشتراکی سلطنت کی تباہی کے بعد دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر شروع ہونے والا عالمی نظام بھی موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری کے مابین سرد جنگ ختم ہوگئی۔ اب ایک بار پھر پرانے عالمی نظام کی خاکستر سے ایک نئے عالمی نظام نے جنم لیا ہے۔ اس نظام کے ناخداؤں کی امید اور تشویش بھی وہی ہے جس کی صورت گری نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ملتی ہے اور جس کا علمی بیان ٹائن بی کے متذکرہ بالا اقتباس میں موجود ہے۔ آج ایک بار پھر مغربی دنیا کو مسلمانوں کی ممکنہ بیداری، امکانی اتحاد اور خودمختاری سے خوف آنے لگا ہے اور وہ اس فکر میں مبتلا ہے کہ:۔

آشکارا ہو نہ جائے شرعِ پیغمبر کہیں
خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

مگر ساتھ ہی ساتھ اسے اپنی ابلیسی حکمت عملی کے حسب سابق بارآور ہونے کی امید بھی ہے:۔

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقین

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

مغربی دنیا کے ان اندیشہ ہائے دور و دراز کی عکاسی کرتے ہوئے برنارڈ لیوس اپنی کتاب "Islam and the West" میں رقم طراز ہیں:

"ہر چند اسلام ایک توانا سیاسی قوت ہے تاہم یہ قوت ابھی تک بے سمت ہے۔ اسلامی اتحاد کے نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کی متعدد مساعی عمل میں لائی گئی ہیں مگر ان میں سے ہر ایک کوشش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ ناکامی کی سب سے بڑی وجہ انقلابی قیادت کا فقدان ہے۔ تمام اسلامی ممالک میں عوام ایسی قیادت کے ظہور کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ڈریں اس وقت سے جب ایسی قیادت سامنے آ جائے گی"۔

دیکھا آپ نے؟ حقیقی اسلامی نظام کے نفاذ کے امکانات کے خلاف ابلیسی نظام کی تمام تر پیش بندیوں کی کامیابی کا دارومدار فرقہ واریت کے فروغ اور استحکام پر ہے۔ ابلیس کی حکمت عملی یہ ہے کہ مسلمان اسلام کی حقیقی آفاقی روح کو فراموش کر کے دورِ ملوکیت میں پیدا ہونے اور پنپنے والے مذاہب فقہ کی تقلید کی خو میں راسخ ہو کر خود کو باہم متحارب مذہبی گروہ بندیوں میں تقسیم کیے رکھیں۔ آئین پیغمبر یا شرع پیغمبر کے نفاذ کا مطالبہ کرنے کی بجائے وہ اپنے اپنے امام مجتہد کی تعبیر و تفسیر کے نفاذ کے مطالبہ پر ڈٹ کر ایسی صورت حال پیدا کر دیں جس میں کوئی ایک نظام فقہ بھی نافذ نہ ہو سکے۔ اسلامی اتحاد کی بجائے فرقہ وارانہ نفاق کی مکدر فضاء میں نہ تو مسلمان محمد ﷺ سے وفا کا حق ادا کر سکتے ہیں نہ ہی دہر میں اسمِ محمد سے اجالا ہو سکتا ہے۔ اقبال کا ابلیس بھی یہی چاہتا ہے۔

مسلمانوں کی غلامی اور ذلت اور مغربی دنیا کے عروج اور بالادستی کے دو عالمی نظام یکے بعد دیگرے رفت گزشت ہوئے اور مغربی بالادستی ہی کے تیسرے

عالمی نظام کی بنیادیں آج استوار ہو رہی ہیں۔ اس نئے عالمی نظام نے بھی ابلیسیت کی کوکھ ہی سے جنم لیا ہے اور اسی کی آغوش میں پروان چڑھ رہا ہے۔ فرقہ واریت اس کی آنکھوں کا تارا ہے اور شرعِ پیغمبر اس کے لیے موت کا پیغام ہے۔ ہمارا اور اسلام کا مستقبل خود ہمارے عزم و عمل میں پوشیدہ ہے۔

دیکھنا چاہیے کہ ہم تلبیسِ ابلیس پر قائم رہتے ہیں یا پھر اسے رد کر کے عشقِ رسول کے عملی تقاضوں کو لبیک کہتے ہیں؟ اگر ہم پہلی روش پر ہی جمے اور ڈٹے رہے تو ابلیس کی امیدیں پوری ہوں گی اور اگر ہم نے دوسرے راستے کو اختیار کر لیا تو پھر ابلیس کے اندیشے درست ثابت ہو جائیں گے اور اس کی خوف و دہشت میں کانپتی ہوئی آواز افق تا افق گونجنے لگے گی:۔

الحذر! آئینِ پیغمبر سے سوبار الحذر!

قیامِ پاکستان کا پرجوش خیر مقدم کرتے وقت ٹوئن بی نے ہمیں فرقہ واریت کے فتنہ سے خبردار کرنا ضروری سمجھا تھا۔ فرقہ وارانہ مذہبی جنون کو پاکستان کے استحکام اور بقاء کے لیے زہر قاتل قرار دیتے وقت فلسفہ تاریخ کے اس نامور شناور نے کتنا درست اور کیسا بروقت انتباہ کیا تھا مگر افسوس کہ ہمارے دینی اور سیاسی قائدین نے آج تک اس بیان کی دوررس معنویت پر غور کرنا مناسب نہیں سمجھا:۔

''اسلام سے وفا کا مشترکہ عہد ہی وہ ناقابلِ تسخیر قوت ہے جس نے اسلامیانِ پاکستان کو باہم متحد کر رکھا ہے۔ مگر اب میں ایک متنازع بات چھیڑ رہا ہوں اور وہ یہ کہ اگر کبھی پاکستان کو ایک متعصب اور ناروادار مسلمان ریاست بنانے کی کوشش کی گئی تو پاکستان تباہی کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ ہر چند اس وقت پاکستان نسلی اور لسانی اختلافات کو مٹا کر اسلام کے پرچم تلے متحد ہے مگر یکسانیت کے نام پر مذہبی فرقہ آرائی کو ہوا دینے سے پاکستان اسلام ہی کے نام پر ٹوٹ جائے گا۔ پاکستان میں اسلام کسی ایک فرقہ کے

پیروکاروں تک محدود نہیں ہے۔ ان تمام فرقوں کو مل جل کر دوستوں کی
مانند زندہ رہنا ہے۔

اگر پاکستانی اخوت و مساوات کی اس منزل کو پالیں گے تو یہ
ایک ایسا انوکھا روحانی تجربہ بن جائے گا جو نہ صرف پاکستان بلکہ
ساری کی ساری دنیائے انسانیت کی ترقی اور سربلندی کی نوید بن
جائے گا''۔

ہمارے ہاں مذہبی جنون اور دہشت گردی کے پس پردہ جو بھی اندرونی اور بیرونی ہاتھ کارفرما ہیں انہیں الزام دینے سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف کرنا انتہائی ضروری ہے کہ طلوع آزادی سے لے کر اب تک ہم نے اسلامی تعلیمات کو اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی رہبر و رہنما بنانے کے فریضہ سے مجرمانہ غفلت کا ارتکاب کیا ہے۔ حریت و مساوات اور محبت و اخوت کا مرکز انسان کا دل ہے مگر اس کا عملی ظہور اقتصادی مساوات اور انسانی برابری کے اصول و اقدار کو طاقتور ریاستی اداروں میں ڈھالے بغیر ناممکن ہے۔ شہنشاہوں نے یہ اسلامی ادارے اس لیے قائم نہیں کیے کہ ان اداروں کے قیام سے وہ شہنشاہ نہیں رہتے بلکہ قانون کی اندھی گرفت میں تڑپتے ہوئے عامی بن جاتے ہیں۔ آزادی کے بعد ہم نے مسلمان کی بجائے شہنشاہ بننے کی ٹھانی۔ غلام محمد سے لے کر آج تک شہنشاہ ہی ہم پر مسلط رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے تو آج تک ان نکتہ ہائے بصیرت کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جو ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' سے برآمد ہوتے ہیں مگر ملت اسلامیہ کے دشمنوں نے اس نظم کے تہ در تہ معانی و مطالب کو خوب سمجھ رکھا ہے اور وہ ابلیس کے فرمان پر صدق دل کے ساتھ عمل کرتے چلے آ رہے ہیں۔

اقبال، قرآن اور پاکستان

اقبال کے ہاں اسلام کی انقلابی تعبیر اور پاکستان کے عصری حقائق کے درمیان روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی ہوئی خلیج کا خیال کرتا ہوں تو مجھے اقبال کی ایک چھوٹی سی نظم ''اجتہاد'' یاد آتی ہے جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:-

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

ستم ظریفی دیکھیے کہ آج ہم فکرِ اقبال کو صرف اس وجہ سے ناقص قرار دینے لگے ہیں کہ اس میں اسلام بیزار اور پاکستان دشمن قوتوں کے ساتھ دوستی کی گنجائش موجود نہیں۔ نتیجہ یہ کہ فلسفہء خودی کے عظیم مفکر کے تصورات کی یہ سرزمین آج خودی کی موت کا دلدوز منظر پیش کر رہی ہے اور ہمارے محقق یہ ثابت کرنے کے لیے دور کی کوڑیاں جمع کرنے میں مصروف ہیں کہ تصورِ پاکستان سے اقبال کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اقبال اور پاکستان کے حوالے سے یہ بحث نئی نہیں، بہت پرانی ہے۔ سن چالیس میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد پنڈت نہرو اور چند کانگرس نواز دانشوروں نے یہ بحث چھیڑی تھی جسے خود قائداعظم نے اپنے انجام تک پہنچا دیا تھا۔ بابائے قوم نے جہاں یہ اعلان کیا تھا کہ اقبال میرے دوست، فلسفی اور رہنما تھے وہاں

انہوں نے اپنے نام اقبال کے خطوط بھی اس اعتراف کے ساتھ شائع کر دیئے تھے کہ اقبال کے نظریات کے زیر اثر ہی وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔ مقام حیرت ہے کہ سن چالیس سے سن سینتالیس تک جس استدلال کے ساتھ تحریک پاکستان کی نفی کی جارہی تھی اور جس کی پرزور اور محکم تردید قیام پاکستان کی صورت میں ہوگئی تھی وہی ردکردہ استدلال آج پاکستان کے اندر فروغ پانے لگا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے جن خیالات کا اظہار تحریک پاکستان کے مخالفین کر رہے تھے وہی استدلال آج پاکستانی دانشور پیش کر رہے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے جس استدلال کو مسلمانوں کے خاص و عام باطل قرار دیتے تھے، ہم پاکستانی آج ان ہی بے پرکی باتوں پر کان دھرنے لگے ہیں۔

قومی طرز احساس کے اس زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران ہم نے اسلام کے اس انقلابی تصور کے عملی نفاذ کی جانب ایک قدم بھی نہیں بڑھایا جو تصور پاکستان کا سرچشمہ اور تحریک پاکستان کی قوت محرکہ تھا۔ اقبال کا تصور پاکستان ایک دھندلا اور مبہم خواب نہیں بلکہ ایک واضح اور متعین مسلک اور ایک ٹھوس اور عملی لائحہ عمل ہے۔ سن تیس کے خطبہ الہ آباد میں اقبال نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھا تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ اسلام اور مسلمانوں کے مقدر پر انہماک میں بسر کیا ہے جس کی بدولت وہ دیگر سیاسی اور دینی زعماء کے برعکس اسلام کے اجتماعی مقدر سے مایوس نہیں ہیں۔ جب ان کے پیش کردہ پروگرام پر اورتو اور اس زمانے کی مسلم لیگ تک نے کوئی توجہ نہ دی تو سن بتیس میں کل ہند مسلم کانفرنس کے خطبہ صدارت میں انہوں نے جہاں اس خدشہ کا اظہار کیا کہ ہماری قیادت موجودہ مشکلات کو ناقابل عبور سمجھ کر باطل کے ساتھ سمجھوتہ بازی پر آمادہ نظر آتی ہے وہاں ایک پیغمبرانہ تلقین کے ساتھ بزرگ نسل کی گمراہی کا علاج نوجوانوں کے عزم و عمل میں دیکھا۔ ایمان کی آگ کو شباب کی آگ میں حل کردینے کی دعوت دیتے ہوئے اقبال نے یوتھ لیگز کے قیام پر زور دیا۔

نوجوانوں کی ان انجمنوں کے اراکین کو دور دراز قصبات اور دیہات تک پھیل کر تہذیبی اور اقتصادی شعور عام کرنے کا پروگرام دیا۔ اس خطبہ میں اقبال نے اگر ایک طرف نوجوانوں کو اسلام کے انقلابی پیغام کو سمجھنے کی دعوت دی تو دوسری جانب انہیں اس حقیقت کو جاننے کی تلقین بھی کی کہ برصغیر میں اسلام کی بقا کا انحصار کسانوں کو جاگیرداری کی زنجیروں سے آزاد کرانے میں مضمر ہے۔ اسلام کی یہی حقیقی روح اقبال کی شہرۂ آفاق تصنیف ''جاوید نامہ'' میں بھی جلوہ گر ہے۔

سن بتیس ہی میں شائع ہونے والے اس معجزہ فن میں اقبال، جمال الدین افغانی کی زبانی، عالم قرآنی کے خدوخال پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جو ابھی تک قرآن حکیم میں پوشیدہ ہے۔ جب اس دنیا کا ظہور ہوگا تو دنیائے انسانیت یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے گی کہ اس دنیا کی شام دنیائے فرنگ کی صبح سے بھی زیادہ روشن ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں زمین اور اس کے سینے میں دفن خزانے اللہ کی ملکیت ہیں، جس میں آقا اور غلام یکساں شرف انسانی کے حامل ہیں، جہاں انسانی مساوات کا مرکز شکم نہیں دل ہے، جہاں رنگ اور نسل کے امتیازات مفقود ہیں، جہاں آدمی نہ خود کسی کا غلام ہے اور نہ کسی دوسرے کو اپنا غلام بناتا ہے۔ جہاں حکمت خیر کثیر ہے اور سرمایہ داری کا نہ کوئی نام ہے نہ نشان:-

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اس دنیا کے باطن کو کسی تغیر کا غم نہیں مگر اس کا ظاہر ہر لمحہ ایک نئے انقلاب سے عبارت ہے۔ اس 'عالم قرآنی' کے محکمات بے نقاب کرتے وقت اقبال مسلمان معاشروں پر عرب ملوکیت اور مغربی استعمار کے زہریلے اثرات بھی نمایاں کرتے ہیں۔ یہ عرب ملوکیت اور فرنگی، سامراج ہی کا کیا دھرا ہے کہ عالم قرآنی ابھی تک پردہ تقدیر میں مستور ہے۔ یہ مثالی دنیا ابھی تک اس لیے ظہور نہیں پا سکی کہ:-

منزل و مقصودِ قرآں دیگرے
رسم و آئینِ مسلماں دیگرے

عالم قرآنی کو وجود میں لانے کے لیے ہندی مسلمانوں کی ایک جداگانہ اسلامی مملکت کا قیام ناگزیر ہے مگر سیاسی قائدین یا تو ابن الوقت ہیں یا روحانی بصیرت سے بے نصیب۔ بس لے دے کے ایک محمد علی جناح ہیں جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہیں خط پہ خط لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ Letters of Iqbal to Jinnah میں سے سن سینتیس کے ایک خط کو تو ایک امریکی محقق نے An Economic Blueprint of Pakistan. کا نام دیا ہے۔ اس خط میں اقبال، جناح کو بتاتے ہیں کہ مسلمان عوام اس وقت تک مسلم لیگ سے دور ہی رہیں گے جب تک یہ جماعت غریبوں کی روٹی روزگار کے مسائل کا کوئی تشفی بخش حل پیش نہیں کرتی۔ اقبال، جواہر لعل نہرو کی بے خدا سوشلزم کو رد کرتے ہوئے جناح کو اسلامی شریعت کی جانب متوجہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خوش قسمتی سے اسلامی شریعت میں روٹی روزگار کے مسائل کا اشتراکیت سے بھی کامل تر حل موجود ہے مگر اسلامی شریعت کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق نافذ کرنے کے لیے ایک جداگانہ اسلامی مملکت کا قیام ناگزیر ہے۔ صرف تین سال بعد محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ نے اقبال کی دکھائی ہوئی راہ اختیار کر لی۔ اقبال کی دکھائی ہوئی راہ کو اپناتے ہی مسٹر جناح، قائداعظم بن گئے، پورے اسلامی ہند کے کوچہ و بازار میں یہ صدا گونجنے لگی:۔

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

اور دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان عدم سے وجود میں آ گیا۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی ہماری جاگیردار قیادت اور فرنگی مآب افسر شاہی نے اقبال کی راہ ترک کر دی کیونکہ انقلابی اسلام جاگیرداری اور سرداری کے سے نظاموں کی موت اور فرنگی انداز سیاست سے نجات کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا اور یہ سب خرافات ہماری قیادت کو اسلام سے بڑھ کر پیاری ہیں:۔

داغم از رسوائیِ ایں کارواں

در امیرِ او ندیدم نورِ جاں

تن پرست و جاہ مست و کم نگاہ
اندرونش بے نصیب از لاالہ
در حرم زاد و کلیسا را مرید
پردۂ ناموسِ ما را بر درید
دامنِ او را گرفتن ابلہی است
سینۂ او از دلِ روشن تہی است
اندریں رہ تکیہ برخود کن کہ مرد
صیدِ آہو با سگِ کورے نکرد

گزشتہ پچاس برس ہم اقبال کے پیغام کو بھلا کر، اپنی ذات پر تکیہ کرنے کی بجائے کلیسا، کے مرید رہنماؤں پر اعتماد کرتے چلے آرہے ہیں۔ گویا، اقبال کے لفظوں میں، اندھے کتے سے توقع کرتے چلے آرہے ہیں کہ وہ ہمیں ہرن کا شکار کھلائے گا۔ یہ اندھے کتے کی بینائی پر اعتماد ہی کا نتیجہ ہے کہ پچاس برس پیشتر عدم سے وجود میں آجانے والے پاکستان کے بارے میں آج ہم وجود سے عدم میں چلے جانے کی سناونیاں سن رہے ہیں۔

اس صورت حال کے ذمہ داریوں تو ہم سب ہیں مگر سب سے بڑی ذمہ داری فرنگی انداز سیاست اور علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے۔ اپنی کتاب ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں اقبال اسلامی سیاست اور سامراجی سیاست میں فرق بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں حکمرانی اور درویشی کا امتزاج ہوتا ہے اور فرنگی سیاست میں حکمرانی اور شیطانی یکجا ہو جاتے ہیں:-

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ
تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ
زخم ازو، نشتر ازو، سوزن ازو
ما و جوئے خون و امیدِ رفو

خود بدانی پادشاہی قاہری است
قاہری در عصر ما سوداگری است
تختۂ دُکاں، شریکِ تخت و تاج
از تجارت نفع و از شاہی خراج

گویا سوداگر حکمران تخت حکومت پر متمکن ہونے کے باوجود کار جہانبانی کی فکر سے کہیں زیادہ اپنی دکان کے تھڑے کی فکر میں پیچاں وغلطاں رہتا ہے۔ اس لیے عوام کو اس پر اعتماد کرنے کی بجائے اپنی ذات پر اعتماد کرنا پڑتا ہے یعنی اپنی خودی بیدار رکھنی پڑتی ہے۔

اقبال اپنے عہد کے بیشتر مذہبی رہنماؤں کو دین نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حکمت سے ناآشنا اور فرقہ آرائی میں محو دیکھتے تھے اس لیے ان کی اس کتاب کا بیشتر حصہ ''اسرار شریعت'' کے بیان پر مشتمل ہے۔ وہ صوفی و ملا کو اپنے زاویوں اور حجروں کی نیم تاریک فضا سے نکل کر زندگی کی وسیع وعریض رزم گاہ میں اترنے کی دعوت دیتے ہیں:

اے کہ می نازی بہ قرآن عظیم
تاکجا در حجرہ می باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن
نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن
کس نگردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اقبال کی نظر میں اسلامی شریعت کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا محتاج نہ رہے مگر اقبال کے عہد کے بیشتر علماء غریب اور محتاج خلق خدا کے روٹی روزگار کے مسائل کو عملاً دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے کر فقط تعزیر و تکفیر کا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان میں کوئی شاہ ولی اللہ کا سا جامع المتفرقین تو کجا، حجتہ اللہ البالغہ کے اس نکتے کو سمجھنے والا بھی پیدا نہ ہوا کہ جس معاشرے کی اقتصادی

تنظیم فرعونی اصولوں پر قائم ہو اس میں اسلامی اخلاق نہ پیدا ہو سکتا ہے نہ پنپ سکتا ہے۔ ایسے میں اقبال نے ہم پر اسلام کی انقلابی روح کو منکشف کرنے کا فریضہ بھی خود ہی سرانجام دیا۔ افسوس صد افسوس کہ اس انقلابی اسلام کو ہم نے آج تک پاکستان میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اقبال پکار رہے ہیں:

بولہب را حیدرِ کرار کن

مگر ہم حیدر کرارؓ کی درویشی یا قاہری کا مسلک چھوڑ کر ابولہب کی شہنشاہیت کے آگے جھولیاں پھیلا پھیلا کر بھیک مانگنے میں مصروف ہیں اور پاکستان کی نظریاتی اساس کو عالمی بینک اور آئی ایم ایف وغیرہم کے ہاتھ گروی رکھنے کو راہ نجات سمجھنے لگے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ سمندر پار سے پڑھایا جانے والا یہ سبق طوطے کی طرح رٹنے میں محو ہیں کہ یہ نظریاتی سیاست کا دور نہیں مفاداتی سیاست کا عہد ہے......... اس طرح کی ابن الوقت سیاست کی چاکری میں مصروف قائدین کو یہ بات ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ پاکستان کا جغرافیائی وجود اقبال کی اسلامی انقلابی فکر سے پھوٹا ہے اگر آج ہم اپنے نظریاتی وجود کو عالمی مالیاتی اداروں کے مفادات پر بیچ دیں گے تو کل ہمارا جغرافیائی وجود بھی غائب ہو جائے گا، میرے منہ میں خاک!

اقبال، پاکستان اور سید علی میاں

ندوۃ العلماء کا سربراہ اور دنیائے اسلام کے طول و عرض میں قائم متعدد دینی، ادبی اور تہذیبی اداروں کا رفیق و رہنما کہ جسے دنیا کے دیندار مسلمان علی میاں کے اسمِ محبت سے پکارا کرتے تھے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا ہے۔ تجدید دین اور احیائے ملت کے محاذ کا یہ درویش صفت مجاہد اپنی آخری سانس تک دادِ شجاعت دیتا ہوا خود تو دار البقا میں داخل ہو گیا مگر ہماری تہذیبی زندگی کو ویران تر کر گیا۔

یہ دنیائے اسلام کی خوش بختی ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی اور دینی شخصیت اقبال کی شاعری کی روح پرور آب و ہوا میں برگ و بار لائی تھی۔ اقبال سے اپنی عقیدت و محبت کی کہانی کو خود مولانا نے اپنی ایک تحریر میں یوں سمیٹا ہے:-

> ''میری نشو و نما اس عہد میں ہوئی جب اقبال کا فن شہرت کے بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اقبال کا عہد پر جو اثر تھا اس کی مثال کسی اور زمانے کے شاعر و ادیب میں نہیں ملتی...... کلامِ اقبال میری پسند کے معیار پر پورا اترتا اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ میرے فکر و عقیدہ کے ساتھ ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ اکثر میرے شعور اور احساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔ انہیں میں نے اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نوا خواں شاعر پایا اور اپنے بارے میں گواہی یہ ہے کہ جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈ نے

لگا اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینی شروع کردیں۔ احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگی اور رگوں میں شجاعت اسلامی کی رو دوڑنے لگی میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے۔"(۱)

اقبال کے ساتھ ایک عمر کی قلبی یگانگت اور فکری وابستگی نے مولانا کو اپنے زمانے کے علمائے دین میں ایک منفرد اور ممتاز مقام بخش دیا تھا۔ ہمارے علمائے دین میں ایسی کوئی ہستی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی جو ملت اسلامیہ کے امراض کے لئے فکر اقبال کو نسخہ شفا قرار دیتی ہو۔ تحریر و تقریر کے ذریعے اقبال کو دنیائے عرب میں روشناس کرانے کے محرکات پر روشنی ڈالتے وقت مولانا نے بتایا ہے کہ وہ عربوں کو فکری ارتداد سے بچانے میں فکر و شعر اقبال سے کام لینا چاہتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

"یہ کتاب عربی میں' میں نے اس لیے لکھی کہ میں دیکھتا تھا کہ عالم اسلامی و عربی کس طرح جاہلیت قدیمہ و جدیدہ کے دوراہے پر آ کھڑا ہوا ہے جہاں ایک طرف حد سے بڑھی ہوئی قومیت ہے تو دوسری طرف اشتمالیت و اشتراکیت...... اور ان دونوں کا اثر شعر و ادب' سیاسی و تجارتی تعلقات' آرٹ اور فنون لطیفہ تک میں نفوذ کر گیا ہے لیکن وہاں ایسے اہلِ قلم نایاب ہوتے جارہے ہیں جو اس فکری ارتداد کے خلاف صف آرا ہو جاتے جو تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی گرفت میں لیتا جارہا ہے۔ مغربی فکر کی اس مسموم و مکدر فضا میں اس شاعر کی قیمت اور عظمت یقیناً بہت بڑھ جاتی ہے جو گہوارہ اسلام سے بہت دور ایک نو مسلم برہمن خاندان اور ایک ایسے ملک میں پیدا ہوتا ہے جہاں فرنگ اور فرنگی تہذیب کی حکومت ہو۔ وہ عصری اور مغربی علوم وفنون کے بڑے بڑے مرکزوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے مگر پیغام محمدی ﷺ پر اس کا ایمان مضبوط ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ صاحب

ایمان شاعری' داعیانہ نظر اور فلسفیانہ پختہ کاری کی علامت بن جاتا ہے اور اپنے افکار کی ضرب سے برصغیر کے بحرِ منجمد میں ایک شورش و طوفان پیدا کر دیتا ہے جس کی لہریں بحرِ ہند سے گزر کر ساحل عرب اور عالم اسلام کی سرزمین سے ٹکراتی ہیں ...... اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہی وہ فکری ہدیہ ہے جو ہم اسلام کی نئی نسل اور اٹھتے اور ابھرتے ہوئے جوانانِ عرب کو دے سکتے ہیں۔''(۲)

اپنے ہم عصر علمائے دین کی خدمات کے فراخدلانہ اعتراف کے باوجود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اقبال کی ان علماء پر برتری کے قائل ہیں۔ اقبال کی ''نادر شخصیت'' کے ایک آدھ ''کمزور پہلو'' کی جانب انتہائی سرسری اشارہ کرنے کے فوراً بعد کہتے ہیں کہ:-

''میں سمجھتا ہوں کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ پیغامِ محمدی ﷺ کے بقائے دوام، امتِ مسلمہ کے استحکام اور اس کی قائدانہ صلاحیت' عصری نظریات و فلسفہ کی بے مائیگی پر ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس معاملے میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلاء سے بھی آگے ہیں جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ اس کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت حاصل ہے۔''(۳)

دنیائے اسلام میں ''اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' کے موضوع پر اپنی گرانقدر تصنیف میں مولانا نے اقبال کو ''جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر'' قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں:-

''اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں جو

مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل پر پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہ سے نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی' اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا اور ان کا دینی فہم کتاب وسنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس ''آتشِ نمرود'' نے ان کے ہزاروں معاصرین کے برعکس ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا۔''(۴)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھارت کی وہ واحد دینی شخصیت ہیں جو برصغیر میں اسلام کی بقا اقبال کے تصورِ پاکستان کے عملی ظہور میں دیکھتے ہیں' قیامِ پاکستان کو ''اپنی اہمیت' نزاکت اور اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے تاریخ کا ایک اہم ترین اور عہد آفرین واقعہ'' قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ:-

''اقبال کو پورے اخلاص کے ساتھ اس کا یقین اور احساس تھا کہ ایک ایسا خود مختار خطہ مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری ہے جہاں اسلامی زندگی کا ''عمل'' اپنے پورے شعبوں میں جاری رہ سکے اور جہاں صالح سوسائٹی کی تشکیل' اجتماعی زندگی کی تنظیم' اقتصادی مسائل کا حل اور تہذیب کی صحیح وپاکیزہ رہنمائی عقیدہ وعمل' مادیت اور روحانیت اور فرد وجماعت کی ایسی ہم آہنگی پیدا ہو سکے جو لوگوں کو تعجب واعتراف پر مجبور کر دے اور اسلامی ممالک کے رہنماؤں کو اس کی تقلید اور دنیا کے مفکرین کو نئے طرز سے سوچنے پر آمادہ کر سکے۔ یہ سیاسی بالغ نظری اور بلند ہمتی جس کی نظیر اس دور میں عالمِ اسلام میں مشکل سے ملے گی مملکت پاکستان کی بنیاد ہے جس پر اس عظیم ترین اسلامی ریاست کی تعمیر ہوئی تھی اور اس کو اسلامی طریق

زندگی کی ایک تجربہ گاہ قرار دیا۔''(۵)

جولائی ۱۹۷۸ء میں جب مولانا تین ہفتوں کے لئے پاکستان تشریف لائے تو اس ''جدید اسلامی تجربہ گاہ'' کو دولخت ہوئے چند برس گزر چکے تھے اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ کہ اقبال کا فکر و تخیل باقی ماندہ پاکستان میں اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔ اپنے مختصر قیام کے دوران مولانا نے کراچی سے لے کر اکوڑہ خٹک تک پاکستان کے طول و عرض میں جو تقاریر کیں وہ ''حدیث پاکستان'' کے عنوان سے ایک الگ کتاب کی صورت میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مولانا نے اس عظیم المیہ کو اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ سمجھا اور سمجھایا ہے۔ مولانا نے نہ تو تلخی کا اظہار کیا اور نہ ہی غم و غصہ کے جذبات سے مغلوب ہوئے انہوں نے ایک جہاندیدہ، شفیق اور فیاض بزرگ کے انداز میں معنی خیز استعاروں کی زبان میں ہم نادان بچوں کو احساس دلایا ہے کہ ہم نے کھیل ہی کھیل میں اپنا، دنیائے اسلام کا اور نوع انسان کا مستقبل کس قدر ویران کر دیا ہے؟

ان تقاریر میں مولانا نے ہماری بے یقینی و ناامیدی اور بے دلی و مایوسی کو ایک نئے جوش عمل اور ایک تازہ ولولۂ حیات میں بدلنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے اشعار اور اقبال کی لفظیات و تراکیب کے برمحل استعمال سے انہوں نے تصور پاکستان کو پھر سے اجاگر کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مولانا تعمیر پاکستان کو تعمیر انسانیت کا بار امانت ٹھہراتے ہوئے ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ:-

> ''جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں وہ ایک معجزہ کے طالب ہیں، یہ معجزہ اسلام کے ابدی پیغام میں مضمر ہے۔
>
> بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
> جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟
>
> اس وقت پاکستان کو ایک ضربِ کلیمی کی ضرورت ہے بلکہ تمام عرب اور اسلامی ملکوں میں بھی زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ہے۔ آپ فکری طور پر عالمِ اسلام کی رہنمائی کے

لئے آگے بڑھیں اور اسلام پر اعتماد پیدا کریں۔ پاکستان ایک معمل ایک تجربہ گاہ ہے جو یہ ثابت کرے گا کہ اسلامی نظریات اس دور میں چل سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔"(۶)

ہماری ویران کھیتی میں تازہ تمنائیں اور نئے خواب وہی شخص کاشت کر سکتا ہے جس کی رگوں میں اقبال کی شاعری خون بن کر گردش کر رہی ہو، جو سرزمین پاکستان میں اقبال کے تصور پاکستان کو عملاً جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہو، جو ہم اہل پاکستان کے اپنی مملکت کے اساسی نظریات سے انحراف پر انتہائی دلسوزی سے سوچتا ہو اور اپنی سوچ کے نتائج کو دنیائے اسلام کے عمومی تناظر میں گرمی اندیشہ اور جرأت اظہار کے ساتھ یوں پیش کرتا ہو:۔

"جب تک بعض طبقوں کی غربت اور افلاس کا یہ عالم ہے کہ اس کے لاکھوں افراد کو ایک وقت کا کھانا اور بدن ڈھانکنے کے لئے کپڑا میسر نہیں، جب تک ایک حلقہ میں بے اندازہ دولت اور مجرمانہ زراندوزی اور عوام کی دولت کا بے حیائی کے ساتھ استعمال بے عقلی اور جنون کی حد تک جاری ہے، جب تک امراء و اہل ثروت کے تعیش اور فسق و فجور کے افسوسناک قصے زیب داستان و نقلِ محفل بنے ہیں، جب تک جہالت و ناخواندگی عام ہے، جب تک ان ممالک کے علمائے دین اور رہنمایانِ ملت اپنے دینی فریضہ کی ادائیگی اور امراء و اغنیاء کے سامنے کلمہ حق کہنے کی جرأت سے محروم ہیں اور مناصب اور عہدوں کے لیے کشمکش یا غیر اہم اختلافی مسائل پر جنگ و جدال اور زور آزمائی اور رسہ کشی ان کی روایت بنی رہتی ہے اس وقت تک یہ ممالک اخلاقی و سیاسی انتشار سے دوچار اور سیاسی و فوجی انقلابات کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے یہ ممالک آتش فشاں کے دہانہ پر کھڑے ہوئے ہیں جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے"۔ (۷)

یوں تو مسلمان ممالک کی یہ صورتِ حال سید علی میاں کے لئے عمر بھر سوہانِ روح بنی رہی مگر پاکستان کے حوالے سے ان کا درد و کرب ہمیشہ اپنی انتہاؤں کو چھوتا رہا۔ اس لئے کہ ہم پاکستانیوں کی غفلت سے ایک مثالی اسلامی معاشرے کی تشکیل کا خواب مٹی میں ملتا نظر آتا ہے۔ رفتند کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر چنانچہ وہ بڑی دلسوزی کے ساتھ ہمیں ہماری لیلائے مقاصد کی جانب متوجہ کرتے رہے۔

مولانا کی وفات سے ہم ایک صاحب نظر اقبال شناس ہی سے نہیں بلکہ ایک دردمند پاکستان شناس سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ مولانا کی اقبال شناسی غیر مشروط نہ تھی۔ وہ اقبال کی تمامتر تحسین کے باوجود اُن کے اجتہادی کارنامہ کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب ''نقوشِ اقبال'' میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھی ہے کہ:-

> ''میں اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا۔ اقبال کے یہاں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو اُن کے علم و فن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے۔ اُن کے مدراس کے خطبات میں جو انگریزی میں Reconstruction of Islamic Thought کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور اُن کا اردو اور عربی میں ترجمہ بھی ہوا ہے بہت سے ایسے خیالات و افکار ملتے ہیں جن کی تاویل و توجیہہ اہلِ سنت کے اجتماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے، یہی احساس اُستادِ محترم مولانا سید سلیمان ندوی کا تھا اُن کی تمنا تھی کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا۔''(۸)

بیشتر علمائے دین کی مانند مولانا کو اقبال کا اجتہادی رویہ اتنا ناگوار گزرا ہے کہ وہ اُن کی عہد آفرین تصنیف کا اصلی نام بھی اپنے حافظے میں محفوظ نہیں رکھ سکے۔

علمائے دین کا اعتراض یہ ہے کہ اقبال اہلِ سنت کے موروثی عقائد کے مقلد نہیں ہیں اور وہ مسلمانوں کے مذاہبِ فقہ کی حد بندیوں سے اوپر اُٹھ کر اسلام کی حقیقی روح کی بازیافت چاہتے ہیں اور اس حقیقی روح کو روحِ عصر کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال اسلام کو کسی ایک فرقے میں محدود کرنے کی بجائے پوری انسانیت کے لیے از سرِ نو تفسیر کرتے ہیں اور اپنی تفسیر و تعبیر کو حرفِ آخر قرار نہیں دیتے۔ اقبال کے نزدیک اسلام کی کسی ایک فرقہ وارانہ تعبیر کو حرفِ آخر قرار دینا اور کسی امام کو اُس پر سند ماننا مُلّائیت ہے۔

....

حواشی

(۱) نقوشِ اقبال۔ صفحات ۳۵ تا ۴۰

(۲) نقوشِ اقبال۔ صفحات ۴۰ تا ۴۲

(۳) نقوشِ اقبال۔ صفحات ۴۰

(۴) صفحہ ۲۴۰

(۵) نقوشِ اقبال۔ صفحہ ۱۲۱

(۶) حدیثِ پاکستان۔ صفحہ ۹۸

(۷) اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ صفحات ۴۹ تا ۵۰

(۸) نقوشِ اقبال۔ صفحات ۳۹ تا ۴۰

علامہ اقبالؒ، امام خمینی اور ترکِ فرنگ

اقبال نے ایک ابدی صداقت اور لازوال حکمت کو شعر کے پیرائے میں یوں بیان کیا ہے:

جہاں تازہ کہ افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اقبال کو مصور پاکستان اور مفکر اسلام تو مانتے ہیں مگر اقبال کی فکر سے روشنی لینے سے انکاری ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران ہم اقبال کے نئے خیالات سے پاکستان کے اندر ایک نئی دنیا پیدا کرنے کی بجائے امریکہ سے سنگ وخشت درآمد کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ ڈھیروں ڈھیر مستعار لیے گئے اس اینٹ روڑے کے بوجھ تلے دب کر پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا مگر ہم نے عبرت پکڑنا تھی نہ پکڑی۔ عمل سے اپنی زندگی کو جنت بنانے کے فرض سے روگردانی ہمارا شیوہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ فکر اقبال سے انحراف سے اگر آج ہم تذل من تشاء کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے میں مصروف ہیں تو فکر اقبال کے اثبات سے اہلِ ایران تعز من تشاء کی اجلی فضاؤں میں محو پرواز ہیں۔ سچ ہے:-

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے!

ڈاکٹر علی شریعتی سے لے کر سابق صدر خامنہ ای تک ایران کے متعدد

دانشوروں اور سیاستدانوں نے انقلاب ایران میں اقبال کے فیضان کی تحسین کی ہے۔ فکر اقبال کو سب سے بڑا خراج تحسین خود امام خمینی کا وہ خط ہے جو انہوں نے جنوری ۱۹۸۹ء میں سوویت یونین کے صدر مسٹر گورباچوف کو لکھا تھا۔ اس خط میں اقبال کے ان انقلابی خیالات کی حرف بہ حرف ترجمانی کی گئی ہے جو انہوں نے ''جاوید نامہ'' کے فلک عطارد پر ''پیغام افغانی باملت رُوسیہ'' کے زیر عنوان بیان کر رکھے ہیں۔ اس خط سے سرسٹھ (۶۷) برس پہلے، اقبال کی اس عہد آفرین فارسی تصنیف کی اشاعت پر کسے معلوم تھا کہ اقبال کی یہ صدائے شاعرانہ بہت جلد ایک انقلابی مسلمان کی عملی سیاسی جدوجہد کا منشور بن جائے گی؟ اشتراکی روس کے آخری صدر کو مخاطب کرتے ہوئے امام خمینی نے لکھا تھا:۔

> ''آپ کی اور سوویت قوم کی خوشحالی اور سعادت کی تمنا کرتے ہوئے ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ سب سے پہلا مسئلہ جو یقیناً آپ کی کامیابی کا سبب بنے گا یہ ہے کہ اپنے اسلاف کی سیاست کو جو معاشرے میں خُدا اور مذہب سے دوری پر مبنی ہے اور جس نے بلا شک و شبہ روسی عوام پر کاری ضرب لگائی ہے، دوبارہ نظر غائر سے دیکھیے اور یقین رکھیے کہ عالمی مسائل سے حقیقی طور پر نمٹنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ البتہ ممکن ہے کہ آپ کے پیش رو کمیونسٹ رہنماؤں کو غلط پالیسیوں اور نادرست اقتصادی کارکردگی کی وجہ سے مغربی دُنیا کا چہرہ زیادہ پرکشش نظر آتا ہو لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ آپ کا اصلی مسئلہ آپ کا خُدا پر پختہ ایمان کا فقدان ہے۔ مارکسزم اب تک انسان کی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ایک مادی مکتب فکر ہے اور مادیت کے ذریعے انسانیت کو روحانی بے یقینی کے بحران سے، جو مشرق و مغرب میں انسانی معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے، نجات نہیں

دے سکتے۔ خدشہ ہے کہ آپ مارکسزم کی دیواروں کو توڑتے وقت
کہیں مغرب اور بڑے شیطان کے چنگل میں نہ پھنس جائیں۔''

اقبال نے جمال الدین افغانی کی زبانی ملت روسیہ کو اپنے پیغام میں مسلمانوں کے عروج و زوال سے سبق اندوز ہونے کی تلقین کرتے ہوئے دو خطرات سے خبردار کیا تھا۔ ایک خطرے کی صورت اندرونی تھی تو دوسرے کی بیرونی۔ اندرونی خطرہ دہریت اور نفی کے مقام پر منجمد ہو کر رہ جانے کا خطرہ تھا تو بیرونی خطرہ مغربی استعماری گوناگوں حکمت عملیوں کی صورت میں درپیش تھا۔ اقبال نے ہر دو خطرات کی نشاندہی بھی کی تھی اور ان کا علاج بھی بتایا تھا:-

تو کہ طرح دیگرے انداختی
دل ز دستور کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں
قیصریت را شکستی استخواں
تا بر افروزی چراغے در ضمیر
عبرتے از سرگزشت ما بگیر
پائے خود محکم گزار اندر نبرد
گرد ایں لات و ہبل دیگر مگرد
باز می آئی سوئے اقوام شرق
بستہ ایام تو با ایام شرق
کہنہ شد افرنگ را آئین ودیں
سوئے آں دیر کہن دیگر مبیں
کردۂ کار خداونداں تمام
بگذر از لا اگر جوئندہ
تا رہِ اثبات گیری زندہ

اے کہ می خواہی نظام عالمے
جستہ اُورا بر اساس محکمے!

اقبال نے سوویت یونین کو فرنگ یعنی مغربی سامراج کی چالوں سے ہوشیار رہنے کا درس دیتے وقت مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا مقدر دنیائے مغرب کی بجائے اقوام مشرق سے وابستہ کر دے۔ سوویت روس نے مشرق کی بجائے اپنی تقدیر مغربی ممالک کے ساتھ جوڑ لی۔ نتیجہ یہ کہ مغرب کی استعماری چالوں نے جب اسے ایک ہمہ گیر بحران میں مبتلا کر دیا تو امام خمینی نے اپنے مکتوب میں برملا اس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ اس بحران سے نکلنے کے لیے اشتراکی روس کہیں شیطان بزرگ یعنی امریکہ کے دام فریب میں پھنس کر نہ رہ جائے۔ یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ مغرب کے چنگل سے نکلنے کا راستہ اب بھی وہی ہے جس کی نشاندہی برسوں پہلے اقبال کر چکے ہیں:-

باز می آئی سوئے اقوام شرق
بستہ ایام تو با ایام شرق۔۔!

اقبال نے سوویت معاشرے کو درپیش جس دوسرے بڑے خطرے کا احساس دلایا تھا وہ انقلاب کو انقلاب مسلسل بنانے کے فرض سے غفلت سے عبارت ہے۔ معاشرے کو نفی سے اثبات کی جانب، لا سے لا اللہ کی جانب دائم متحرک رکھنا زندگی کا ناگزیر مطالبہ ہے۔ اس تقاضے سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر سوویت معاشرے پر قرآن حکیم سے روشنی لینا لازم آتا ہے:-

داستان کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از ام الکتاب
با سیہ فاماں ید بیضا کہ داد؟
مژدہ لا قیصر و کسریٰ کہ داد؟
در گزر از جلوہ ہائے رنگ رنگ
خویش را دریاب از ترکِ فرنگ

گر ز مکر غریباں باشی خبیر
روبہی بگذر و شیری پیشہ گیر
چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندہ بے ساز و برگ
بندۂ مومن امیں، حق مالک است
غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است
نقش قرآن تا دریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است!

ان ہی خیالات کا اظہار امام خمینی نے اپنے خط میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

''گورباچوف صاحب، میں آپ سے چاہوں گا کہ اسلام کے بارے میں سنجیدگی سے تحقیق اور غور کریں۔ اس لیے نہیں کہ اسلام یا مسلمان قوموں کو آپ کی ضرورت ہے بلکہ اس لیے کہ اسلام کے اعلیٰ اور آفاقی اقدار قوموں کی نجات کا وسیلہ بن سکتے ہیں اور انسانیت کی مشکلات کی مشکل کشائی کر سکتے ہیں۔ کیا وہ مذہب جس نے ایران کو سپر طاقتوں کے مقابلے میں چٹان کی مانند مضبوط اور استوار رکھا ہے، معاشرے کے لیے افیون ہے؟......... البتہ وہ مذہب جو کہ اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے مادی اور اخلاقی سرمائے اور دولت کو اجنبی طاقتوں اور سپر طاقتوں کے سپرد کرنے میں مددگار رہوں اور بانگ دہل اعلان کریں کہ دین سیاست سے جدا ہے وہ واقعی معاشرے کے لیے افیون کا اثر رکھتے ہیں لیکن ایسا مذہب ہرگز حقیقی مذہب نہیں ہے بلکہ اس قسم کا مذہب ہے جسے ہمارے لوگ امریکی مذہب کے نام

سے جانتے ہیں۔''

امام خمینی اس مارکسی اندازِ فکر کو درست قرار دیتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں مذہب کو افیون کے مانند استعمال کیا گیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ''ملت روسیہ'' کو اس بات کی جانب بھی متوجہ کرتے ہیں کہ ''امریکی مذہب'' کے برعکس حقیقی اسلام ایک ہمہ گیر انقلابی مسلک ہے۔ اقبال نے اپنی عظیم نظم ''جاوید نامہ'' میں اس انقلابی دین کو اشتراکیت سے کہیں زیادہ کامل تر بتایا ہے۔ یہاں اقبال نے روسی اشتراکیت کو اسلام کے انقلاب مسلسل کی جانب بڑھنے کا مشورہ دیا ہے:-

بگذر از لا جانب الا خرام

سوویت یونین کے قائدین نے اقبال اور خمینی کے اس پیغام پر عمل نہ کیا اور یوں سوویت یونین کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ یہ بلاشبہ انسانی تاریخ کا ایک المیہ ہے مگر اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ خود پاکستان میں مصورِ پاکستان کے انقلابی افکار سے کھلم کھلا انحراف کیا گیا۔ اقبال کا ''ملت روسیہ'' کے نام پیغام فی الحقیقت ہمارے لیے پیغامِ عمل ہے۔ ہم نے اس پیغام پر اب تک عمل نہیں کیا ہے۔ کیوں نہیں کیا؟.......... ''بازمی آئی سوئے اقوامِ شرق'' کا مشورہ ہمارے لیے صائب ترین حکمتِ عملی ہے۔ آدھا ملک گنوا دینے اور باقی ماندہ ملک کو مغربی استعمار کے مالیاتی اداروں کے آگے گروی رکھ دینے کے بعد بھی ہم اپنی تقدیر مشرق سے وابستہ کرنے کی بجائے فرنگ کی غلامی پر نازاں کیوں ہیں؟...... اس لیے کہ تین سو سال کی غلامی نے ہمیں شیر سے لومڑی بنا دیا ہے۔ ہم ''مکر غربیاں'' سے انتہائی باخبر ہونے کے باوجود ''ترکِ فرنگ'' کی راہ اپنانے سے گریزاں ہیں۔ اقبال پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم جس وقت تک ''ترکِ فرنگ'' نہیں کریں گے اس وقت تک نہ تو ہماری اجتماعی ہستی اپنے آپ کو ڈھونڈ پائے گی اور نہ ہی ہمارا انفرادی وجود ہمارا اپنا وجود کہلا سکے گا۔ خویش را دریاب از ترکِ فرنگ!

ہماری فکری، انتظامی اور سیاسی قیادتوں نے یہ ٹھان رکھی ہے کہ وہ کسی

صورت بھی ''ترک فرنگ'' کا مشورہ قبول نہیں کریں گے چنانچہ آج ان کی بے چینی کا سب سے بڑا سبب وہ اندیشہ ہائے دور دراز ہیں جن کا ایک ہی محور ہے اور وہ یہ کہ کہیں خود فرنگ ہی ہمیں ترک نہ کر دے۔ اگر فرنگ نے ہمیں ترک کر دیا تو ہمارا کیا بنے گا؟ اس پر مجھے امام خمینی یاد آتے ہیں جنہوں نے گورباچوف کو بتایا تھا کہ ''آپ کا سب سے بڑا مسئلہ آپ کا خدا پر پختہ ایمان کا فقدان ہے۔'' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ فقرہ ایک تھپڑ ہو جو گورباچوف کے نہیں بلکہ ہمارے منہ پر مار دیا گیا ہو۔ اس صورتحال پر مجھے اقبال بہت افسردہ دکھائی دیتے ہیں۔ ہاں وہ غمگین ہیں اور بار بار ایک ہی مصرع دہرائے چلے جا رہے ہیں:-

ترا ناداں امید غمگساری ہا ز افرنگ است!

خویش را دریاب از ترکِ فرنگ

ترک فرنگ اقبال کے درس خودی کا بنیادی سبق ہے۔ مغرب کے سیاسی اور تہذیبی استبداد سے مکمل نجات کی خاطر مشرق کو ترک فرنگ کی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ اقبال نے انقلابی سیاسی جدوجہد کے لیے ترک فرنگ کی ترکیب استعمال کی ہے۔ ترک فرنگ سے اسلامی مشرق کا ترک دنیا میں روحانی انہماک یاد آتا ہے۔ چنانچہ سیاسی جدوجہد روحانی عبادت کے صوفیانہ مفہوم کی حامل ہو جاتی ہے۔ اقبال دنیائے اسلام کو ترک دنیا کا مسلک چھوڑ کر ترک فرنگ یعنی اپنی دنیا کو مغرب کے ہمہ گیر غلبہ سے آزاد کرانے کے کار ثواب کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ یوں ترک فرنگ کی لفظی ترکیب مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو عرب شہنشاہیت اور فرنگی سامراج ہر دو کے زہریلے اثرات سے پاک کر دینے کے عمل کا استعارہ بن جاتی ہے۔

معرکۂ کربلا کے آس پاس جب مسلمان حکمرانوں نے اسلامی معیار و اقدار سے روگردانی کرتے ہوئے قیصر و کسریٰ کے طرز حکومت اور انداز حیات کی جانب مراجعت کی راہ اپنائی تو حق پرستوں میں سے چند ایک نے ستیز مگر بیشتر نے گریز کی ٹھانی۔ اہلِ خیر رفتہ رفتہ ترکِ دنیا کے صوفیانہ مسلک سے وابستہ ہو کر رہ گئے تو

دنیا اہل شر کے گھر کی کنیز بن کر رہ گئی۔ ان ہی دنیا دار لوگوں میں سے کئی خاندان حکمران خاندان قرار پائے اور مشرق و مغرب میں صدیوں تک تخت ملوکیت پر جلوہ گر رہے۔ ان خاندانوں نے زوال اور یورپ کے عروج کے نتیجہ میں اسلامی مشرق یورپی سامراج کے جال میں ایک صید زبوں بن کر رہ گیا۔ ہم تو رخصت ہوئے غیروں نے سنبھالی دنیا۔ مسلمانوں کے زوال پسند حکمران طبقات نے جب غیر مسلم شہنشاہوں کی غلامی اختیار کر کے انعام بھی پایا اور نام بھی کمایا تو ''تھا جو نا خواب بتدریج وہی خواب ہوا''۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں آ پہنچی کہ:۔

شیخ او، لُردِ فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقام با یزید
گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است
دولت اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گرد کلیسا کرد و مرد

ہر چند مسلمان ملکوں میں سیاہ و سفید کا مالک ریا کار حکمران طبقہ حضرت بایزید بسطامی کے سے صوفیائے باصفا سے نمائشی اور کھوکھلی عقیدت کا ڈھول پیٹتا رہا ہے تاہم فی الحقیقت وہ لردِ فرنگی کا مرید ہے (اقبال نے لرد کو انگریزی لفظ لارڈ (Lord) کا اسم تحقیر بنا کر جگہ جگہ استعمال کیا ہے) براہ راست آقائی کا دور ختم ہو جانے کے بعد اب پیر فرنگ یورپ اور امریکہ میں بیٹھا ریموٹ کنٹرول سے مسلمان ممالک کے حکمران طبقوں پر مشتمل اپنے مریدوں کی فوج ظفر موج کے ذریعے پورے مشرق کو اپنی گرفت میں رکھنے کی حکمت عملیوں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہے۔ ساحرِ افرنگ کے یہ مرید اپنے اپنے دائرہ ہائے عمل میں مغرب کی اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی بالا دستی کو مذہبی تقدس کا درجہ دینے میں عبادت کی حد تک منہمک ہیں۔ ان کے خیال میں زندگی کی تمام تر رونقیں مغرب کی غلامی کی برکتیں ہیں۔ اقبال کے بقول یہ لوگ اپنی

خودی کی سوداگری اور فرنگ کی چاکری میں نسل در نسل سرگرم عمل رہنے سے غیرت و حمیت کے احساسات سے عاری ہو چکے ہیں (رقص با گردکلیسا کردومرد) اقبال کو اس طبقۂ خواص میں نہ کوئی خیر نظر آتی ہے اور نہ کوئی خوبی:-

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام

دیدہ ام صدق و صفا را در عوام

ارباب کذب وریا پر مشتمل حکمران طبقہ عوام کو جنس بازار سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ خودلرد فرنگی کا مرید ہے یعنی اپنے مغربی آقا و مولا کی پرستش میں یکسوئی، انہماک اور انجذاب کی خاطر اس نے اپنی دنیا ترک کر رکھی ہے۔ اپنی قوم کے مصائب ومشکلات سے غافل ہو کر وہ صرف اور صرف استعمار کے پیر کی خوشنودی کے لیے چلے پہ چلہ کاٹ رہا ہے۔ چنانچہ جب تک مسلمان ممالک کے یہ حکمران طبقے ترک فرنگ پر مجبور نہیں کر دیئے جاتے تب تک نہ تو مشرق کی اندھیری رات ختم ہو سکتی ہے اور نہ ہی مشرق اپنی عظمت رفتہ کی بازیافت کے عمل کا آغاز کر سکتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ اقبال کے ہاں ''ترک فرنگ'' کا مطلب کیا ہے؟...... اقبال کے کلام میں فرنگ مغربی سامراج کا استعارہ ہے۔ جہاں وہ مغرب کی سامراجی شخصیت اور اس کے استحصالی کردار کے دشمن ہیں وہاں وہ مغربی علوم وفنون اور مغربی سائنس وٹیکنالوجی کو مومن کا گم شدہ مال سمجھتے ہیں۔ ''جاوید نامہ'' میں وہ ہمیں مغربی تہذیب کے خارجی مظاہر سے بے نیاز ہو کر اس کی باطنی حرکی روح سے ہم رشتہ ہونے کی تلقین کرتے ہیں اور مغربی علوم وفنون کو اسلامی علوم وفنون ہی کی ترقی یافتہ صورت قرار دیتے ہیں:-

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب

نے ز رقص دختران بے حجاب!

نے ز سحر ساحران لالہ روست

نے بہ عریاں ساق ونے از قطعِ مُوست!

محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خط لاطینی است!
قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است!

اقبال کا کہنا ہے کہ مغرب نے علم وحکمت اور سائنس وٹیکنالوجی کے چراغ ہم مسلمانوں کی آگ ہی سے روشن کیے ہیں۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے اپنے علم و فن کی روشنی سے یورپ کے تاریک زمانوں کو منور کر کے یورپ کی حیات نو کا سامان کیا تھا۔ یہ ہمیں تھے جنھوں نے عہد کہن کو ختم کر کے عہد جدید کی بنیادیں استوار کی تھیں:-

اک جہاں تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورش قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا

مگر پھر سانحہ یہ ہوا کہ خود مسلمان سو گئے اور حکمت وہنر کی شمع ان کے ہاتھوں سے مغربی ہاتھوں کو منتقل ہو گئی۔ مسلمان پانچ سو سال تک خواب غفلت میں پڑے سوتے رہے اور مغربی دنیا مسلمانوں کے علوم وفنون کو مزید ترقیوں سے ہمکنار کرنے میں مصروف رہی اور نت نئے انکشافات اور ہر آن نئی ایجادات سے ثروت مند بناتی رہی۔ جب مسلمان صدیوں کی گہری نیند سے بیدار ہوئے اور مسلمانوں کی نئی نسلیں مغربی تہذیب کی جانب والہانہ انداز میں پیش قدمی کرنے لگیں تو اقبال داستانوں کی بڑھیا کی مانند بہ یک وقت ہنس بھی پڑے اور رو بھی دیئے۔ اقبال بے حد خوش ہوئے کہ مسلمان علم وحکمت اور ایجاد واختراع کے میدانوں میں اپنی پانچ صدیوں کی غفلت کی تلافی کرنے نکلے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اس گمان میں مبتلا بھی ہوئے کہ کہیں یہ لوگ مغربی تہذیب کی اندرونی حرکی روح تک رسائی حاصل کرنے کی بجائے اس کی

ظاہری چمک دمک میں ہی کھو کر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ہم پر یہ حقیقت روشن تر کردی کہ مغرب کی قوت کا راز نہ تو چنگ ورباب میں ہے اور نہ رقص بے حجاب میں۔ نہ ننگی پنڈلیوں میں ہے اور نہ کٹے ہوئے بالوں میں۔ نہ لاطینی رسم الخط میں ہے اور نہ لادینی طرز حیات میں۔ اس کے برعکس مغرب کی اصل طاقت علم وفن اور حکمت و ہنر میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے ہمیں مغربی تہذیب و معاشرت کی باطنی روح سے دوستی کرنا ہوگی۔ مغربی علم وحکمت سے اکتساب گویا اپنی ہی آتش رفتہ کا سراغ پانے اور اپنے ہی کھوئے ہوئے معیار و اقدار کا سراغ لگانے کا عمل ہے۔ اس عمل میں ہمیں تقلید کی روش اپنانے کی بجائے صاحب ایجاد بننا ہوگا۔ اقبال ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ:-

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ
مغزمی باید نہ ملبوس فرنگ
اندریں راہ جز نگہ مطلوب نیست
این کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکر چالاکے اگر داری بس است!
طبع دراکے اگر داری بس است!

یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ مغربی تہذیب کی جانب اسلامی مشرق کی پیش قدمی کے باب میں اقبال کی امیدیں تو خاک میں ملتی چلی آرہی ہیں مگر اقبال کے اندیشے درست ثابت ہوتے جارہے ہیں۔ آج بھی ہمارے ہاں علوم تازہ کی سرمستی کی بجائے پاپ میوزک کی خرمستی کو مغربی تہذیب کے نام پر رواج دیا جارہا ہے۔ ایک تخلیقی اور تنقیدی انداز نظر کے ساتھ مغربی تہذیب کے حقیقی باطن تک رسائی کی بجائے فرنگی لات ومنات کی پرستش کو جدیدیت کا نام دیا جارہا ہے۔

اقبال نے اسلام میں دینی تفکر کی نئی تشکیل کے موضوع پر اپنے

مشہور خطبات میں مغربی تہذیب کی اصل اندرونی متحرک روح کو اسلام کی روح کے ساتھ ہم آہنگ قرار دیا تھا اور مغربی تہذیب کے کمالات کو اسلامی کلچر ہی کی توسیع اور نئی تشکیل بتایا تھا مگر ہم مغربی تہذیب کے ظواہر و زوائد میں کچھ یوں الجھ کر رہ گئے ہیں کہ آج مسلمان معاشروں میں مغربیت اور جدیدیت کے نام پر مغربی گمراہیوں کی کورانہ تقلید کا جو چلن عام ہو چکا ہے وہ اسلامی کلچر اور مغربی کلچر ہر دو کی اندرونی روح کی ضد معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کی اندھی اور غلامانہ پیروئ مغربی کی بدترین مثال ترکی کا حکمران طبقہ ہے۔

یورپ کی استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور جنگی حکمت عملی کے باعث سلطنت عثمانیہ کی تباہی کے بعد خلافت کے ملبہ سے نئے ترکی کی تعمیر کو اقبال نے اسلامی مشرق کے لیے ایک بے حد نیک فال سمجھا تھا اور کمال اتاترک کی قیادت کے ساتھ بہت سی خوش آئند توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ آئینی اصلاحات کے زیر اثر ترکی میں جدید جمہوری اداروں کے قیام کو اقبال نے تمام مسلمان ممالک کے لیے ایک قابلِ تقلید اقدام سمجھا تھا۔ قدامت پرست اور کوتاہ اندیش مذہبی رہنماؤں کے ''شرعی حملوں'' میں بھی انہوں نے اتاترک کا دفاع کرتے ہوئے اسے سچا مسلمان قرار دیا تھا مگر بہت جلد وہ ترکوں میں یورپ کی کورانہ تقلید پر تنقید کرنے لگے تھے:-

ترک را آہنگ نو در چنگ نیست
تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست
ترک از خود رفتہ و مست فرنگ
زہر نوشیں خوردہ از دست فرنگ
بندہ افرنگ از ذوق نمود
می برد از غربیاں رقص و سرور

اقبال بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ ترکی کا حکمران طبقہ یورپی لہو و لعب میں پڑ کر اپنا نقد جان ہار بیٹھا ہے۔ جدت کے نام پر وہ یورپ سے جو معیار و اقدار

درآمد کرنے میں مصروف ہے وہ تو خود یورپ میں فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اقبال کو سب سے زیادہ مایوسی اس بات پر ہوئی تھی کہ ترکی کی قیادت اپنی مسلمان شناخت سے دستبردار ہو کر یورپ کا دم چھلا بننے کو ترقی پسندی سمجھنے لگی ہے:-

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب!

گزشتہ پون صدی کے دوران ترکی نے اپنی دینی اور تہذیبی شخصیت کی مکمل نفی کر ڈالنے اور سراسر یورپی قالب میں ڈھل کر رہ جانے کے ایک ہزار ایک جتن کر دیکھے مگر یورپ کے ''برہمنوں'' نے انہیں اپنے خاکروب سے زیادہ اہمیت کبھی نہ دی۔ یورپیئن یونین کی رکنیت کی ''سعادت دارین'' کے حصول کی خاطر ترکی کی حکومت نے اپنی قومی وملی شناخت پر اصرار کرنے والوں کو صرف پارلیمنٹ کی رکنیت سے ہی نہیں بلکہ ترکی کی شہریت سے بھی محروم کر دیکھا مگر پھر بھی یورپ والوں کو ترکی سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں۔ اس پر یورپ کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی بجائے کہ ''ہم وفادار نہیں تم بھی تو دلدار نہیں'' ترکی اپنی مسلمان شخصیت کے انہدام کی خاطر کیے گئے تازہ اقدامات کی نئی فہرست لے کر یورپیئن یونین کی عدالت میں پھر سے وہی پرانا مقدمہ لے کر پیش ہو جاتا ہے۔ یورپیئن یونین بھی وہی پرانا ٹکا سا جواب دے دیتی ہے کہ لباس اور بالوں کی تراش خراش اور آوارگی واوباشی کے مغربی معیاروں پر پورا اترنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہنس کی چال تو بے شک چل رہے ہو مگر اندر سے ہو تو وہی مشرقی کوے کے کوے، ہم تمہیں یورپیئن مشترکہ منڈی میں برابر کی نشست پر بیٹھنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟

حیرت اس بات پر ہے کہ مغرب کے اس مسلسل اور متواتر ذلت بھرے سلوک نے بھی ترکی کے حکمران طبقے کی قومی غیرت کو کبھی نہیں للکارا۔ بلکہ ان لوگوں نے ہمیشہ غالب کے رقیب کی مانند الٹا ''گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہونے'' کا تاثر دیا ہے۔ ترکی نے خود کو یورپیئن کہلانے کے شوق میں اپنے آپ کو مسلمانوں کے

مصائب سے لاتعلق رکھنے میں بڑی محنت کی ہے۔ مسلمانوں کی آزادی کی تحریکوں سے خود کو دور رکھنے کی خاطر انہوں نے بھارت اور اسرائیل کے سے ممالک سے دوستی کو ابدی رنگ دے رکھا ہے۔ عرب اسرائیل جنگوں کے دوران بھی ترکی اور اسرائیل کی مشترکہ جنگی مشقوں کے معمول میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ مگر برا ہو یورپ کا کہ ان ''قربانیوں'' کے باوجود بھی وہ ترکی کو یورپین یونین کی رکنیت دینے سے انکاری ہے۔

ترکی کے ساتھ ساتھ مغرب کی کھوکھلی نقالی اور غلامانہ پیروی کی دوسری نمایاں مثال رضا شاہ پہلوی کا ایران ہے۔ اپنے نام کے مسلمان ہونے پر بھی معذرت خواہ حکمران خاندان، ایران کو مشرق کا سوئٹزرلینڈ بنانے کی دھن میں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے افرنگ سے درآمد کیے گئے لات ومنات وعزیٰ کی پرستش میں محو رہا کرتا تھا۔ چنانچہ اسلامی حریت ومساوات اور اخوت واحسان کے تصورات کو طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے ہوئے اُس نے نسلی قومیت اور جغرافیائیت وطنیت کے جدید مغربی تصورات کو اپنا لیا اور یوں شہنشاہ آریہ مہر کے لقب سے ملقب ہوا۔ ادھر شہنشاہ ایران اس جاہلیتِ جدید کو ترقی پسندی اور سیکولر وسیع النظری قرار دینے میں مصروف تھا اور ادھر بقول فیض احمد فیض:۔

دشت شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقی صبح طرب، نغمہ بلب، ساغر بکف
وہ پہنچ جائے تو ہو گی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیب مقام و منصب و جاہ و شرف!

سات سمندر پار دیار فرنگ میں بیٹھے ہوئے آیت اللہ، روح اللہ، خمینی کے خطبات پر مشتمل آڈیو اور ویڈیو کیسٹ مسجد وخانقاہ سے لے کر کوچہ وبازار تک گردش کر رہے تھے اور ڈاکٹر علی شریعتی ''حسینیہ ارشاد'' کے دینی پلیٹ فارم سے فکر اقبال کو ایرانی نوجوانوں کے دل ودماغ میں اتارنے میں محو تھے۔ رفتہ رفتہ ایران کے عوام کی

بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ فکرِ اقبال میں پوشیدہ صداقتیں عام ہونے لگیں اور کھلا کہ:۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

پھر ہوا یوں کہ مشرق کی بے قرار روحِ ایران کے اسلامی انقلاب کے متحرک قالب میں ڈھلنے لگی اور یہ حقیقت روزِ روشن کی مانند ہر کس و ناکس پر واضح ہوگئی کہ:۔

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست!
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں راہ جز نگہ مطلوب نیست
ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست!

رفتہ رفتہ پورا ایران آریائی شہنشاہیت اور مغربی جمہوریت کے متحدہ محاذ کو شکست دینے کے لیے سڑکوں پر نکل آیا۔ مشرق کی بے چین روح ''مرگ بر شیطان بزرگ'' کے آتشیں نعروں کے ساتھ ''خویش را دریاب از ترکِ فرنگ'' کے جہاد پر نکل کھڑی ہوئی۔ اس جہادِ آزادی نے عملاً اس صداقت کی گواہی پیش کر دی کہ ''نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے، جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے۔'' شیطانِ بزرگ نے ردِ انقلاب کا ہر گر آزما دیکھا، جنگ تک مسلط کر دی مگر اب تک ایران کا اسلامی انقلاب مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ آج دُنیا اُسے انقلابِ مسلسل بنتا دیکھ رہی ہے اور میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ ہمارے مصلحین اقبال کے اس مشورے پر کان کیوں نہیں دھرتے؟:۔ بازمی آئی سوئے اقوامِ شرق!

ہمارے ہاں جب بھی ترکِ فرنگ کی بات چھیڑی جاتی ہے لرزان فرنگی کے مرید عالمی مالیاتی اداروں کی محکومی میں اور زیادہ راسخ ہو جاتے ہیں اور وہ پہلے خود کو

اقتصادی طور پر مضبوط بنانے اور بعدازاں آزاد ہونے کے استدلال کی جگالی کرنے لگتے ہیں۔ کس نداند جلوہ آب از سراب!۔ ہماری غربت کا راز ہی ان سرمایہ دارانہ اداروں اوران کے سرپرست مغربی ممالک کی اقتصادی محکومی میں پنہاں ہے۔ جب تک ہم صحیح معنوں میں آزاد نہ ہوں گے ہماری غربت اور معاشی محتاجی دور نہ ہو سکے گی ،بقول اقبال:

سب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں!

اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اللہ جسے نان جویں بخشتا ہے اسے ہی بازوئے حیدر بھی عطا کرتا ہے۔ یہ حقیقت الحقائق علامہ اقبال کی شاعری اور امام خمینی کے عمل سے روشن تر ہوگئی ہے۔ آخر وہ دن کب آئے گا جب ہم ''بستہ ایام تو باایام شرق!'' کی صدا پر لبیک کہہ اٹھیں گے؟

اقبال اور آج کا ترکی

یہ حقیقت کتنی المناک ہے کہ ہم نے اقبال کی اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا ہے اور اقبال کے اندیشوں کو سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ عالمِ عرب ہو یا دُنیائے عجم، آج کی ملتِ اسلامیہ پر نظر ڈالنے سے یہ سنگین حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اقبال کو اتاترک کی قیادت میں صورت پذیر ہونے والی جدید ترکی ریاست سے بہت اُمیدیں تھیں۔ وہ سوچتے تھے کہ اتاترک نے ایک جدید مسلمان قومی ریاست کے قیام سے ترکی کو تو مٹنے سے بچایا ہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ دُنیائے اسلام میں متعدد جدید اور حرکت پسند مسلمان قومی ریاستوں کے قیام کی راہ ہموار کر دی ہے۔ یہ جدید مسلمان ریاستیں وقتی طور پر اپنی اپنی قومی حدود کے اندر غوطہ زن ہوں گی، اپنے مسائل حل کر کے طاقتور قومیں بنیں گی اور یوں وہ وقت بہت جلد آ جائے گا جب یہ آزاد، خودمختار اور طاقتور مسلمان قومیں اپنی ایک الگ مسلم لیگ آف نیشنز قائم کر ڈالیں گی۔ اقبال کے نزدیک عہدِ حاضر میں ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کا یہی راستہ ہے۔ آزاد، خودمختار اور طاقتور قوموں کا یہی رضا کارانہ اتحاد ایک سچے اسلامی اتحاد کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ نہ تو بیشتر اسلامی ریاستیں صحیح معنوں میں آزاد اور خودمختار ہیں اور نہ ہی کسی ایسے بین الاقوامی مسلمان اتحاد کے امکانات دور دور تک نظر آتے ہیں۔ سو، اقبال نے جس اسلامی اتحاد کا خواب دیکھا تھا وہ ہنوز خواب ہی ہے۔ اسی طرح ترکی میں اتاترک کی قیادت

میں نظام سیاست اور نظام معاشرت میں جو اجتہادی رجحانات سامنے آئے تھے وہ اقبال کی زندگی ہی میں جمود اور زوال کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ اس دار فانی سے کوچ کرنے سے ذرا پہلے اقبال ہمیں بتا گئے تھے کہ نہ تو مصطفیٰ کمال پر اور نہ ہی رضا شاہ پہلوی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مشرق کی بے قرار روح کسی نئے بدن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو وہ ترکی معاشرے میں برپا اسلام اور سیکولرزم کی کشمکش کو دیکھ کر شاید یہی کہتے کہ محکومی اور جمود نے ترکی کے حکمران طبقے کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں اُسے نہ تو اسلام کا مفہوم سمجھ آ رہا ہے اور نہ ہی سیکولرزم کا۔

دنیائے اسلام کا قافلہ سالار یا یورپ کا خاکروب؟

ذہنی غلامی کسی قوم کو بلندیوں سے گرا کر کیونکر پستیوں کا مکین بنا دیتی ہے؟.......... اس سوال کا بہترین جواب آج کا ترکی ہے جہاں مشرقی جمہوریت اور مغربی آمریت کے درمیان کشمکش اور تصادم کی فضا سنگین سے سنگین تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ چند گرہ کپڑا جسے عرف عام میں ''حجاب'' کہتے ہیں اس تہذیبی اور سیاسی جنگ کا سب سے بڑا محرک بن کر رہ گیا ہے۔ ترکی کا حکمران طبقہ جو مغرب کی اندھا دھند تقلید کو سیکولرزم سمجھنے کے مغالطے میں مبتلا ہے، ''حجاب'' کو انقلابی اسلام کی علامت قرار دیتا ہے۔ چنانچہ خواتین کو حجاب کے ساتھ یعنی سر ڈھانک کر قومی اور سرکاری تقریبات میں شامل ہونے سے روکتا ہے۔ کسی بھی سرکاری دانش گاہ، دفتر یا عمارت میں خواتین کے سر ڈھانک کے داخل ہونے پر پابندی عائد کی جا چکی ہے۔ یہ پابندی اسلام اور سیکولرزم ہر دو کی روح کے منافی ہے۔ سیکولرزم صرف اور محض آئینی اور قانونی بہانہ ہے۔ اصل تصادم مغربی نظام اقدار اور مسلمانوں کے مشرقی نظام اقدار کے درمیان برپا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں کے مسلمان اپنی اسلامی شناخت کو پہچاننے اور اس پر فخر کرنے لگے ہیں۔ اس اسلامی شناخت سے پھوٹنے اور اسے نمایاں سے نمایاں تر کرنے والی اقدار کے سامنے مغربی نظام اقدار پسپا ہونے لگا ہے اس صورت

حال نے مغرب زدہ حکمران طبقے اور اس کے امریکی آقاؤں کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ مغربی نظام اقدار کو سنگینوں اور ٹینکوں کے ذریعے مسلط رکھنے کی حماقت اور اس حماقت کی تکرار کو ترقی پسندی اور روشن خیالی کا نام دینے لگے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کمال اتاترک کا نام نامی بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ بے شک اتاترک سیکولر قائد تھے مگر سیکولرزم کا یہ مطلب کہاں ہے کہ پہننے اوڑھنے سے لے کر بولنے چالنے تک جس چلن پر بھی اسلامی مشرق کی چھاپ نظر آئے اس پر جبری طور پر پابندی لگا دی جائے۔

علامہ اقبال جدید ترکی کے بانی کمال اتاترک کی اصلاحات کے پر جوش حامی تھے وہ سمجھتے تھے کہ تجدید اور ترقی کے جوش میں اگر اتاترک سے کچھ غلطیاں بھی ہو رہی ہیں تو ان غلطیوں کو اس خیال سے گوارا کر لینا چاہیے کہ تجدید پسندوں کو اپنے تجربات سے پھوٹنے والا علم دوبارہ سیدھی راہ پر لے آئے گا۔ اقبال اتاترک کی حمایت تو کرتے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ اتاترک کی پالیسیوں کے زیر اثر ترکی میں یورپ کی اندھا دھند تقلید کے خطرات سے بھی آگاہ تھے۔ وہ ترکوں کو یورپ کا مقلد بننے کی بجائے اپنا مقدر اسلامی مشرق سے وابستہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب!

ترکی کے حکمران طبقے نے یورپین یونین میں شمولیت کی خاطر ہزار منتیں کیں، ناک رگڑی مگر یورپ کے حکمران اس مسلمان ملک کے سیکولر حکمرانوں کی درخواستیں برس ہا برس سے ٹھکراتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے برعکس ترکی جب تک اپنی مسلمان شناخت سے وابستہ رہا تب تک دنیائے اسلام کا قافلہ سالار بنا رہا۔ ان ترکوں کو اس حقیقت کا بخوبی احساس ہے جو ایک طویل مدت تک یورپ اور امریکہ میں مقیم رہے۔ ان لوگوں نے سیکولرزم کی خوشنما قبا میں یورپ اور امریکہ کی نسل پرستی اور عیسائی احیائیت کا تشدد برداشت کیا ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ سیکولرزم کا مطلب

کیا ہے؟ اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر یہ لوگ سیکولرزم کی نیلم پری کے لباس میں دیو استبداد کو کالی دیوی کا شاگرد رشید بن کر ناچتے ہوئے پہچان چکے ہیں۔ اس لیے اب ان میں اپنی انفرادی اور اجتماعی شخصیت کو قبول کرنے اور اس پر ناز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ ویلفیئر پارٹی کے لیڈر نجم الدین اربکان ایک عمر جرمنی میں سیکولرزم کی حقیقت سمجھنے کے بعد ترکی واپس آئے تھے۔ سچ کہا تھا اقبال نے:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے

تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

یورپ سے مسلمان بن کر لوٹنے والے نجم الدین اربکان نے ویلفیئر پارٹی بنائی جو عوامی جمہوری جدوجہد سے انتخابات جیت کر حکمران بنی مگر ترکی کی امریکہ نواز فوجی اور سیاسی قوتوں نے جمہوری عمل کا راستہ روک کر اپنی سیکولر آمریت مسلط کر دی۔ ویلفیئر پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ نئے انتخابات میں ''درچو'' پارٹی مقبول عام ہو کر اسمبلی میں پہنچی تو پہلے ہی روز اس کی ایک منتخب رکن پارلیمنٹ کو صرف اس جرم میں پہلے اسمبلی سے اور پھر ترکی کی شہریت سے نکال باہر کر دیا گیا کہ وہ سر ڈھانک کر اسمبلی میں آئی تھی۔ اب اس نئی پارٹی کو بھی اپنی عوامی مقبولیت کے باوجود سیاسی عمل سے باہر کر دینے کی کارروائی شروع ہو چکی ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ نجم الدین کی طرح یہ خاتون محترم بھی کسی دینی مدرسے سے اٹھ کر نہیں آئی بلکہ امریکہ میں قیام کے دوران اس نے اپنی کھوئی ہوئی مسلمان شناخت دوبارہ حاصل کی ہے۔ سیکولرزم کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ ۔۔۔ اس سوال کا جواب ان لوگوں نے پینٹاں گاں (امریکی محکمہ دفاع) کے ریسرچ سکالروں سے نہیں پوچھا بلکہ یورپ اور امریکہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں جیتی جاگتی سیکولر زندگی سے سیکھا ہے۔ مغرب کی عملی زندگی سے سبق اندوز ہو کر تقلید کی روش چھوڑنے والوں کی تعداد اب ترکی میں بہت زیادہ ہے۔ اقبال نے اتاترک کی جدید ترکی کے جدید فیشنوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:-

تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست!

یعنی جو چیز مغرب میں فرسودہ ہو کر متروک ہو چکی ہے اسے یہ تقلید پرست اپنے ہاں تازہ سمجھ کر رائج کرنے میں مصروف ہیں۔ اقبال نے یہ بھی کہا تھا کہ:-

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

نجم الدین اربکان سے لے کر حجاب کی خاطر اسمبلی کی رکنیت کو ٹھکرا دینے والی خاتون عزیز تک لاکھوں ترک آج مشرق کی بے قرار روح بن کر ترکی کے جسد اجتماعی میں اپنا گھر بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جدیدیت کی نارسائیوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ جدیدیت کی قوت کہاں ہے اور کمزوری کہاں ہے؟۔۔۔ اسے یہ خوب پہچانتے ہیں۔ اقبال نے دنیائے اسلام کو تجدید و ترقی کی راہوں پر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے جدیدیت کے امراض سے اپنا دامن بچانے کا مشورہ دیا تھا:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست
نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست
محکمی اورا نہ از لادینی است
نے فروغش از خط لاطینی است
قوت مغرب ازاں علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

اقبال نے خبردار کیا تھا کہ مغرب کی طاقت کا راز نہ تو چنگ و رباب میں ہے نہ بیٹیوں کے ننگے ناچ میں ہے نہ خوبصورت عورتوں کی ننگی پنڈلیوں اور کٹے ہوئے بالوں میں ہے نہ لادینی طرز فکر اور لاطینی رسم الخط میں مغرب کی طاقت کا بھید پوشیدہ

ہے۔ اس کے برعکس مغرب کی قوت اور اقتدار کا سرچشمہ انسانی اور سائنسی علوم میں ترقی میں پوشیدہ ہے اور سائنس وحکمت کا یہ چراغ مغرب نے ہماری آگ سے ہی روشن کیا ہے۔

ترکی کے مسلمان ان اشعار میں پوشیدہ صداقت کو مغرب میں عملاً دیکھ اور برت کر آئے ہیں۔ اس لیے وہ ننگی پنڈلیوں، کٹے ہوئے بالوں، رقص وسرور اور لاطینی رسم الخط کو سیکولرزم کی علامت نہیں سمجھتے۔ اس کے برعکس وہ سائنسی اور علمی ورثہ کو مغرب کے سیکولرزم کا اصل دین مانتے ہیں اور سائنسی علوم کے چراغ کو روشن رکھنے کے لیے مسلمانوں کی آگ کو پھر سے بھڑکانے میں مصروف ہیں۔

لادینی ولاطینی، کس پیچ میں الجھا تو؟

اپنا سر ڈھانکنے کی آزادی کے تحفظ میں اسمبلی کی رکنیت اور ترکی کی شہریت سے محروم ہونے والی رکن پارلیمنٹ محترمہ مروہ کوئی پسماندہ اور قدامت پسند خاتون نہیں بلکہ ایک پڑھی لکھی جدید، روشن خیال، سیاسی اور تہذیبی شخصیت ہیں۔ وہ امریکہ کے شہر ٹیکساس سے کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم میں فارغ التحصیل ہو کر آئی ہیں اور عام انتخابات میں ورچو (فضیلت) پارٹی کے ٹکٹ پر استنبول سے منتخب ہوئی ہیں۔ یہ فضیلت پارٹی نجم الدین اربکان کی رفاہ (ویلفیئر) پارٹی کی خاکستر سے پیدا ہوئی تھی۔ ہر دو پارٹیوں کے نام میں اسلام کا لفظ شامل نہیں ہے مگر اس کے باوجود ترکی کا امریکہ اور نیٹو کی دُہری غلامی پر نازاں حکمران طبقہ ان برائے نام نہیں بلکہ درحقیقت مسلمان سیاسی پارٹیوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف ہے۔ رفاہ کے بعد اب فضیلت کو بھی غیر قانونی قرار دینے کے حیلے بہانے ڈھونڈے جا رہے ہیں۔ یہ حیلہ ساز اور بہانے باز یہ نہیں جانتے کہ فضیلت پارٹی کی راکھ سے بھی ققنس کی مانند ایک نئی پارٹی جنم لے لے گی۔ احتساب کرنے والوں کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان جدید اور روشن خیال مسلمانوں پر ملائیت کی تہمت نہیں تراشی جا سکتی۔ یہ لوگ حکمران طبقہ کے ساتھ اسی طبقہ کے ہتھیاروں کے ساتھ نظریاتی اور فکری جہاد میں مصروف ہیں۔ ۲/مئی ۱۹۹۹ء کو

ترکی پارلیمنٹ میں محترمہ مروہ نے اپنی خوئے حجاب پر ہنگامہ برپا ہوتے دیکھا تو فوراً پارلیمنٹ سے باہر آ کر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ دوران گفتگو اس دانشمند اور صاحب ایمان خاتون نے اپنے نکتہ چینوں کو یوں للکارا:-

"میرے سکارف کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ ایک سیاسی علامت ہے لیکن یہ سکارف تو میں اپنے عقیدے اور ایمان کی وجہ سے اوڑھتی ہوں اور یہ میرا ذاتی انتخاب ہے۔ مجھے اسمبلی کا حلف لینے سے روک دیا گیا ہے۔ آخر کیوں؟ ۔۔۔ یہ تو بین الاقوامی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے اور ترکی کی حکومت نے انسانی حقوق کے اس چارٹر پر دستخط کیے ہوئے ہیں۔ مجھے میرے انسانی حقوق سے محروم کر کے موجودہ حکومت نے ترکی کو دنیا بھر میں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ سکارف پہننے سے آئین کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہیں ہوئی، فضیلت پارٹی نے انتخابات کی مہم کے دوران انسانی حقوق کی واضح طور پر وکالت کی تھی اور میں اپنے ووٹروں کے جذبات و احساسات کی نمائندگی کر رہی ہوں"۔

ترکی میں انسانی حقوق کی تنظیم اور انسانی حقوق واخوت کی تنظیم نے محترمہ مروہ کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے عورتوں کے سر ڈھانکنے کو سیکولرزم اور لبرل ازم کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق اور محترمہ مروہ کی حجاب پسندی کے مخالفین کو تنگ نظر اور جنون کی حد تک متعصب قرار دیا ہے۔

انسانی حقوق کی مغرب نژاد تنظیموں کی جانب سے محترمہ مروہ کے استدلال کی اس واضح، قطعی اور مکمل حمایت کے باوجود صدر سلیمان ڈیمرل اور بلند ایجوت وہ کچھ کر گزرے ہیں جس کی اسلام اجازت دیتا ہے، نہ سیکولرزم اور نہ ہی ترکی کا آئین۔ اسلام کا دم بھرنا تو خیر ان حکمرانوں کی شریعت میں ایک مدت سے حرام چلا آ رہا ہے مگر سوال یہ ہے کہ سیکولرزم اور ترکی کے آئین کے ساتھ یہ ناروا سلوک کیوں کیا

جا رہا ہے؟۔۔۔ فقط مغربی نظام اقدار کی بالادستی کی خاطر۔ جو چیز پینٹا گان اور یورپین یونین کو ناپسند ہے وہ انہیں بھی ناپسند ہے اس کی تازہ ترین مثال وزیراعظم بلند ایجوت کا وہ بیان ہے جس کے مطابق یورپ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ترکی کے آئین میں ایک نئی ترمیم لانے کی تجویز زیرغور ہے۔ یہ ترمیم کرد باغی لیڈر کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی عدالت کو انسانی حقوق کی یورپی عدالت کے حسب منشا ازسرنوتشکیل دینے کے لیے لائی جارہی ہے۔

کرد باغی لیڈر پر وطن سے غداری کا مقدمہ جس عدالت میں زیرسماعت ہے وہ تین ججوں پر مشتمل ہے۔ دو جج سویلین ہیں اور ایک جج فوجی ہے۔ یورپی عدالت کوفوجی جج کی موجودگی پر اعتراض ہے۔ بلند ایجوت صاحب نے کل یہ عندیہ ظاہر کیا ہے کہ وہ آئین میں ترمیم کرکے فوجی جج کی جگہ بھی سویلین جج ہی لا بٹھائیں گے تاکہ یورپ کی کھلی سرپرستی میں سرگرم عمل کردش ورکرز پارٹی کے باغی سربراہ پر غداری کا مقدمہ یورپ کے معیاروں کے مطابق سنایا جاسکے۔ سوال یہ ہے کہ اگر غداروں کوسہولت فراہم کرنے کے لیے آئین میں ترمیم کی جاسکتی ہے تو پھر خواتین کو اپنی پسند کے مطابق پہننے اوڑھنے کی آزادی دینے کی خاطر آئین میں ترمیم کیوں نہیں لائی جاسکتی؟

محترمہ مروہ کا استدلال تو یہ ہے کہ ترکی کے آئین میں یہ آزادی پہلے ہی سے موجود ہے اور صدر سلیمان ڈیمرل اور وزیراعظم بلند ایجوت ان سے ان کا یہ آئینی اور انسانی حق چھین کر ترکی کے آئین سے انحراف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ سچ بھی یہی ہے کہ یہ سیکولر ملائیت ترکی کے آئین سے وفاداری کا نہیں بلکہ یورپ کی ذہنی غلامی کا شاخسانہ ہے:۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

ترکی کا حکمران خوئے غلامی میں اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ وہ الٹا محترمہ مروہ

کو غیر ملکی ایجنٹ قرار دے رہا ہے۔ یہاں غیر ملکی کا اشارہ ایران کی طرف ہے جہاں انقلاب کے بعد خواتین نے حجاب پہننا شروع کیا تو دنیائے اسلام کے کونے کونے میں باحیا خواتین کے دل میں حسن حجاب نے ایک گہری کشش پیدا کر دی۔

میں ترکی کے حکمران طبقہ کی مشکلات میں آئے روز اضافہ ہوتا دیکھ رہا ہوں۔ پارلیمنٹ سے تو وہ سیکولر علامتوں کے زوال کے آگے بند باندھنے میں ایک محدود وقت تک کامیاب ہوتے رہیں گے۔ اُن کی یہ محدود کامیابیاں ترکی میں رہی سہی جمہوریت کا جنازہ بھی نکال کر دم لیں گی۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ پارلیمنٹ کی بلڈنگ سے باہر کھیت کھلیان اور منڈی بازار میں اسلامی اقدار کے فروغ کا مقابلہ کیسے کریں گے؟

یورپ اور امریکہ کی چاکری میں مصروف حکمرانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ اسلام کا دم بھرنے والے کاروباری اداروں کی روز افزوں مقبولیت ہے۔ ایسا ہی ایک کاروباری ادارہ کومبسان ہے۔ یہ ان متعدد کاروباری اداروں میں سے ایک ہے جن کا فروغ اور استحکام اس بات کا ثبوت ہے کہ ترکی کی کاروباری اور تجارتی زندگی کی جڑیں مسلمانوں کے بنیادی روحانی تصورات میں دور تک پھیلتی جا رہی ہیں۔ حکمران اس صورت حال کو اپنے لیے ایک نیا خطرہ تصور کرنے لگے ہیں۔

کومبسان کے چیئرمین ہاشم بیرام کھلم کھلا یہ کہتے نہیں تھکتے کہ "ہم مذہبی لوگ ہیں۔ ہم صاحب ایمان لوگ ہیں مگر یہ ہمارے ذاتی عقائد ہیں۔ ان سے سیکولرزم کو کوئی خطرہ نہیں"۔ پورے ترکی میں کومبسان کے تجارتی اداروں اور ریستورانوں کی ایک زنجیر پھیل چکی ہے۔ اس ادارے کے کارکن اسلامی شعائر کے پابند ہیں اور ان کا اثر و رسوخ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ شاپنگ سنٹر اور ریستوران کے ساتھ ساتھ مسجد بھی موجود ہے اور چلڈرن پارک بھی۔ اس ادارے کا ہیڈ کوارٹر قونیہ میں ہے جہاں مولانا جلال الدین رومی کا مزار مرجع خلائق ہے اور جس کے باغ میں مرشد رومی کے مرید ہندی، علامہ اقبال کی یادگار بھی قائم ہے۔ ترکی کے حکمرانوں

کو ان علامتوں کا پورا مفہوم معلوم نہیں۔ وہ تو فقط اتنا جانتے ہیں کہ اس ''خطرناک'' کاروباری ادارے نے اپنے قائم کردہ چلڈرن پارک کو سابق وزیراعظم نجم الدین اربکان کے نام سے منسوب کر دیا ہے اور یوں جس شخص کو حکمرانوں نے دنیائے سیاست کا مردود ٹھہرایا ہے اسے کومبسان کی روحِ رواں جناب ہاشم نے ترک بچوں کے دلوں میں گھر بنا دیا ہے۔

کومبسان کے چالیس ہزار شیئر ہولڈر ہیں اور ان شراکت داروں کی تعداد دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے کیونکہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ خوف خدا رکھنے والا تجارتی ادارہ انہیں کسی صورت میں بھی دھوکہ نہ دے گا۔ جس حقیقت نے حکمرانوں کی نیند میں خلل ڈال رکھا ہے وہ اس طرح کے کاروباری اداروں کے شراکت داروں کے منافع کا استعمال ہے۔ یہ خدا دوست تاجر اپنے منافع کی رقم کو سود خور بنکوں میں جمع کرانے کی بجائے توکل بہ خدا اپنے سرہانوں کے نیچے جوڑتے رہتے ہیں اور ''وقت بے وقت جا و بے جا'' انقلابی اسلامی تحریکوں کی مالی امداد میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور یوں اپنے مغرب زدہ حکمرانوں کو اقبال کی آواز میں آواز ملا کر للکارتے رہتے ہیں:

لادینی و لاطینی، کس پیچ میں الجھا تو؟
دارو ہے ضعیفوں کا لاغالب الا ھو!

یہ صدائے حق ترکی کے موجودہ نظام کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ یہ خطرہ اس نظام کو لے ڈوبے گا۔ وجہ یہ کہ حکمران اور ان کا میڈیا ان نئے خیالات کا مقابلہ خیالات کے ساتھ نہیں بلکہ لاٹھی گولی اور ایجنسیوں کی تفتیشی حکمت عملی کے ساتھ کر رہا ہے۔ چونکہ انقلابی اسلامی تصورات کا مقابلہ فرسودہ سیکولر توہمات کے ساتھ ناممکن ہے اس لیے حکومت جبر و استبداد پر اُتر آئی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

اقبال اور عبادت کا اسلامی تصور

اقبال کی چند آخری یادگار نظموں میں سے ایک مختصر نظم کا عنوان ہے: ''ندائے غیب''۔ یہ نظم گویا مسلمانوں کے یومِ حساب کا منظر پیش کرتی ہے۔اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اللہ میاں مسلمانوں سے چند سوالات پوچھتے ہیں اور آخری حصے میں خود ہی ان سوالات کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔آیئے پہلے اُن چبھتے ہوئے سوالات سے آنکھیں چار کریں جو عہدِ حاضر کی ملتِ اسلامیہ پر ایک فردِ جرم کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔حریم غیب سے جواب طلب کیا جاتا ہے کہ:-

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک!
کس طرح ہوا کُند ترا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمئ افکار، نہ اندیشۂ بیباک!

گویا مسلمانوں کی ذلت کا یہ سبب ہرگز نہیں کہ وہ ارکانِ اسلام کی پیروی میں کوتاہی کے مرتکب ہیں بلکہ اس گناہ کی پاداش میں رُسوائی ان کا مقدر بن کر رہ گئی ہے کہ انھوں نے اپنے جوہرِ ادراک کو گم کر دیا ہے، اپنے نشترِ تحقیق کو کُند کر کے رکھ دیا ہے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو گرمیِ افکار اور اندیشۂ بیباک سے محروم کر رکھا ہے۔ اللہ میاں کی بارگاہ میں مسلمانوں کے یہ گناہ دینِ اسلام سے انحراف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ اس نظم میں اللہ میاں مسلمانوں سے رسمی عبادات کی ادائیگی میں غفلت کا سوال نہیں اٹھاتے بلکہ اسلام کی سائنسی، حرکی اور انقلابی تعلیمات سے مسلمانوں کی روگردانی کو اُن کا سب سے بڑا گناہ قرار دیتے ہیں۔ گناہ و ثواب کے اس تصور پہ مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے:۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

مرزا عبدالقادر بیدل نے آدم کی عظمت کا راز ادراک کی روشنی میں پایا ہے:
''چیست آدم؟ تجلّیِ ادراک''۔ مسلمانوں نے ادراک کے جوہر کو گم اور تحقیق کے نشتر کو کند کر کے اسلام کی حقیقی روح کو فراموش کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اب نہ تو اُن کی نگاہوں سے افلاک لرزتے ہیں، نہ وہ ذروں سے لے کر ستاروں تک کے جگر چاک کر کے اللہ کا جلوہ دیکھنے کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی شعلہ بن کر غیر اللہ کے خس و خاشاک کو جلا کے راکھ کر سکتے ہیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ وہ خود خس و خاشاک کے غلام بن چکے ہیں۔

اسلام میں دینی فکر کی نئی تشکیل کے موضوع پر اقبال نے اپنے مشہور خطبات میں ذاتِ باری کے تصور اور عبادت کے مفہوم پر قرآن کی روشنی میں اظہارِ خیال کرتے وقت سائنسی مشاہدات اور تجربات میں انہماک کو عبادت قرار دیا ہے۔ مظاہرِ فطرت اللہ کی آیات ہیں۔ آیۂ کائنات کی سائنسی تلاوت قربِ خداوندی کا مؤثر ترین وسیلہ ہے چنانچہ:۔

"The scientific observation of Nature

keeps us in close contact with the behaviour of Reality, and thus sharpens our inner perception for a deeper vision of it.....The truth is that all search for knowledge is essentially a form of prayer. The scientific observer of Nature is a kind of mystic seeker in the act of prayer..... This alone will add to his power over Nature and give him that vision of the total infinite which philosophy seeks but cannot find."[1]

اقبال کے خیال میں خالقِ اکبر کی نت نئی تخلیقی اداؤں کا سائنسی مشاہدہ افضل ترین عبادت ہے۔ مظاہرِ فطرت کے مطالعہ میں جذب سائنسدان کو اقبال ایک ایسا صوفی قرار دیتے ہیں جو اللہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ قوانینِ فطرت کی سائنسی تلاش و جستجو کو وہ قربِ خداوندی کا مؤثر وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے رسمی عبادات کی پابندی کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ ان عبادات کی ادائیگی کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں مگر اسے کافی نہیں سمجھتے۔ تسخیرِ کائنات کو وہ رسمی عبادات کی عملی توسیع سمجھتے ہیں۔ کائنات کی تسخیر کی کبھی نہ ختم ہونے والی انسانی تگ و دو کو وہ تکبیرِ مسلسل سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا تسخیر کے اس عمل میں قدم بقدم آگے بڑھتا ہوا انسان کائنات کی وسعتوں اور رفعتوں میں مسلسل نعرۂ تکبیر بلند کرتا جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو سائنسدان واقعتاً ایک خدا مست صوفی نظر آتا ہے۔ ایک ایسا صوفی جو مظاہرِ فطرت کے پردوں میں چھپے ہوئے حجاب اندر حجاب حسنِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنے کی تمنا میں مسلسل آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حق کا ہر نیا جلوہ دیکھ کر وہ حیرت میں گم ہو جاتا ہے اور یوں جمالِ حق کی والہانہ حمد و ثنا میں مصروف رہتا ہے۔ اپنی فارسی نظم

''آئن سٹائن'' میں اقبال اس عظیم سائنسدان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند تجلی کا متلاشی قرار دیتے ہیں:-

جلوۂ می خواست مانند کلیم ناصبور
تا ضمیر مستنیر او کشود اسرار نور
من چہ گویم از مقام آں حکیم نکتہ سنج
کردہ زرد شتے ز نسل موسیٰ و ہاروں ظہور

دل و نگاہ مسلمان ہوں تو کارِ دنیا میں سر کھپانا سراسر عبادت ہے۔ فطرت کے خارجی مظاہر کے باطن میں اُتر کر اُن پر غلبہ حاصل کرنے کے فرض سے روگردانی اللہ تعالیٰ سے روگردانی کے مترادف ہے۔ اسلام میں عبادت کے اس تصور کو اقبال نے اپنی شاعری میں مختلف اور متنوع انداز میں بیان کیا ہے۔ اقبال کی نظر میں کتاب فطرت کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ فطرت کی تسخیر کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔ علم قوت کے بغیر فقط خیال آرائی بن کر رہ جاتا ہے اور قوت علم کے بغیر تخریب کا سبب بن جاتی ہے۔ انسانیت کی روحانی تعمیر و ترقی کے لیے علم اور قوت کا امتزاج از بس ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ذاتِ باری کے تصور اور عبادت کے مفہوم پر روشنی ڈالتے وقت اقبال نے اس حقیقت کی جانب درج ذیل الفاظ میں اشارہ کیا ہے:-

"Vision without power does bring moral elevation but cannot give a lasting culture. Power without vision tends to become destructive and inhuman. Both must combine for the spiritual expansion of humanity."(2)

کائنات کی یہ روحانی تعبیر کارِ جہاں میں انہماک کو بھی اسلام کے نظامِ عبادات کا جزوِ لاینفک قرار دیتی ہے۔ چنانچہ اقبال کی شاعری میں کائنات کی بیک

وقت تفسیر اور تسخیر کے اس روحانی تصور کی جلوہ گری دیدنی ہے۔ یہاں میں صرف ایک قطعہ بطور مثال پیش کرتا ہوں:-

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات!

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اقبال نے ملا کو جمادات اور نباتات میں شمار کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ نہ تو خود آگاہ ہے اور نہ خدا مست۔ جہادِ زندگانی میں دادِ شجاعت دینے کی بجائے وہ کارزارِ حیات سے مفرور ہو کر گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ وہ فقط تسبیح و مناجات میں اپنے انہماک ہی کو وسیلۂ نجات سمجھ بیٹھا ہے۔ اجتہاد کی کٹھن راہ چھوڑ کر وہ تقلید کی روش پر گامزن ہے۔ جب وہ ہر آن بدلتی ہوئی زندگی کے نت نئے تقاضوں کی پکار پر اپنے کان بند کر کے رہبانیت کے غیر اسلامی مسلک پر کاربند ہو گیا تو رفتہ رفتہ ''ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا''۔ اس صورت حال نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عقلی اور سائنسی علوم کی جس مشعل نے یورپ کے ازمنۂ تاریک کو روشن کیا تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے یورپ کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی۔ مسلمان گہری اور میٹھی نیند سو گئے۔ صدیوں پر پھیلے ہوئے ہمارے اس عرصۂ خواب کے دوران مغربی قومیں سائنسی اور تجرباتی علوم کی اس مشعل کو تھامے آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں تا آنکہ دنیائے اسلام میں اقبال جیسے دانائے راز پیدا ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کو اس خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور تسخیرِ فطرت کی عبادت میں مسلسل غفلت کے ہولناک اسباب و نتائج کا تجزیہ کرنا سکھایا۔ اس نظم میں اُٹھایا گیا یہ سوال آج تک دُنیائے اِسلام میں کراں تا

کراں گونج رہا ہے:-

تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟

باطن کی خلافت کی ذمہ داریاں اگر سائنسدان کو صوفی کا مقام بخشتی ہیں تو ظاہر کی خلافت کا چیلنج صوفی کو مردِ حُر کی بلند مسند پر لا بٹھاتا ہے۔ گویا پورا مسلمان ندرتِ فکر اور ندرتِ عمل کی یکجائی سے وجود میں آتا ہے۔ ندرتِ فکر و عمل سے ہی معجزاتِ زندگی ظہور میں آتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک ''عمل ہی بہترین طرزِ تفکر ہے۔'' اقبال کے نزدیک سائنسدان، صوفی اور مردِ حُر بنیادی طور پر ایک ہی شخصیت کے تین رُخ ہیں:-

ہر چہ می بینی ز انوارِ حق است
حکمتِ اشیاز اسرارِ حق است
ہر کہ آیاتِ خُدا بیند حُر است
اصلِ ایں حکمت ز حکمِ اُنظُر است

(پس چہ باید کرد)

وہ ایک ایسا صوفی ہے جو مظاہرِ کائنات کے باطن میں اُتر کر انوارِ حق کا متلاشی بھی رہتا ہے اور رزم گاہِ حیات میں حق کی تائید وحمایت کا فریضہ سرانجام دینے کی خاطر اپنا سر ہتھیلی پر بھی رکھ دیتا ہے:-

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

....

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیشِ نمروداں بزن

....

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب ، ایک کلیم سربکف

....

صف، جنگاہ میں مردانِ خُدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خُدا کی آواز

علامہ اقبال کو ہوش سنبھالتے ہی اس حقیقت نے ایک دائمی اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا کہ: ناپید ہے بندۂ عمل مست .... بندگانِ عمل مست کو اس نایابی نے اقبال کے عہد کی ساری کی ساری دُنیائے اسلام کو تقلید، غلامی اور زوال میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اقبال نے اپنی شاعری اور فلسفے کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی عمل سے دُنیائے اسلام کی اس شدید محرومی کی تلافی کرنے کی عمر بھر جدوجہد کی ہے۔ جہاں انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے بے عمل اور راضی بہ رضا دُنیائے اسلام کو سرگرمِ عمل اور اپنے مقدر کو خود اپنے ہاتھوں میں لینے کا درس دیا ہے۔ وہاں انھوں نے ایک ایسا نظامِ فکر بھی دیا ہے جس کا مرکز ومحور عمل ہے۔ نظم ''ندائے غیب'' کے آخری شعر میں اقبال نے مسلمانوں کی ''محکومی و مسکینی و نومیدیٔ جاوید'' کا بنیادی سبب خود اللہ میاں کی زبانی پیش کیا ہے:-

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری!

درج بالا شعر میں اللہ میاں نے تین قوتوں کو مسلمانوں کے زوال وادبار کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ یہ تین قوتیں ہیں: شہنشاہیت، ملائیت اور خانقاہیت۔ اقبال نے اپنی نثری تحریروں میں بھی ملت اسلامیہ پر ان تین اداروں کے زہریلے اثرات سے مختلف اور متنوع انداز میں بحث کی ہے۔ انیسویں صدی میں اسلامی اصلاحی تحریکوں کے محرکات وعوامل سے بحث کرتے ہوئے وہ بڑے دوٹوک اور قطعی انداز میں انہی تین زوال پسند اداروں کو شدید ترین تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:-

"They (reformers) found the world of

Islam ruled by three main forces and they concentrated their whole energy on creating a revolt against these forces:

1. ***Mullaism***.—The ulama have always been a source of great strength to Islam. But during the course of centuries, especially since the destruction of Baghdad, they became extremely conservative and would not allow any freedom of Ijtihad, i.e., the forming of independent judgement in matters of law. The Wahabi movement which was a source of inspriation to the nineteenth century Muslim reformers was really a revolt against this rigidity of the ulama. Thus the first objective of the nineteenth century Muslim reformers was a fresh orientation of the faith and a freedom to reinterpret the law in the light of advancing experience.

2. ***Mysticism***.—The masses of Islam were swayed by the kind of mysticism which blinked actualities, enervated the people and kept them steeped

in all kinds of superstition. From its high state as a force of spiritual education mysticism had fallen down to a mere means of exploiting the ignorance and the credulity of the people. It gradually and invisibly unnerved the will of Islam and softened it to the extent of seeking relief from rigorous discipline of the law of Islam. The nineteenth century reformers rose in revolt against this mysticism and called Muslims to the broad daylight of the modern world. Not that they were materialists. Their mission was to open the eye of the Muslims to the spirit of Islam which aimed at the conquest of matter and not flight from it.

3. ***Muslim Kings***.—The gaze of Muslim kings was solely fixed on their own dynastic interests and so long as these were protected, they did not hesitate to sell their countries to the highest bidder. To prepare the masses of Muslims for a revolt against such a state of things in the world

of Islam was the special mission of Syed Jamal-ud-Din Afghani."(3)

ہر چند انیسویں صدی کی ان عظیم انقلابی شخصیات کی علمی اور عملی جدوجہد ان تین اداروں کے مادی اور روحانی جبر و استبداد کو ختم کرنے میں ناکام رہی تاہم ان کی فکری و انقلابی جدوجہد اقبال کی سی عہد آفرین شخصیات کے لیے سرچشمۂ فیضان ثابت ہوئی۔ چنانچہ بیسویں صدی میں اقبال کی انقلابی فکر نے مسلمانوں کی حیات نو کا سامان کیا ہے۔ انھوں نے فلسفہ و شعر میں شہنشاہیت، ملائیت اور خانقاہیت کے استحصالی اداروں کی تباہی کو اسلام کی نشاطِ ثانیہ کا اولیں مرحلہ قرار دیا۔ ''ندائے غیب'' ان ہی تین اداروں کو مسلمانوں کے زوال، محکومی اور جمود کا ذمہ دار قرار دیتی ہے اور یوں ان کو مٹا دینے کی جدوجہد کو کارِ ثواب قرار دیتی ہے۔ یہ ہے اقبال کا پیغام..... آج کے نام!

....

حواشی

(1) The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore, 1996, P.73.

(2) Ibid, p.73.Tranlsation of both the extracts, by Shehzad Ahmad is as follows:-

''قدرت کا سائنسی مشاہدہ ہمیں حقیقت کے کردار کے بہت قریب لے جاتا ہے اور یوں اُس کے باطن کا ادراک کرنے کے لیے ہماری بصیرت کو بڑھا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کی جستجو بنیادی طور پر عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔ قدرت کا سائنسی مشاہدہ کرنے والا ایک طرح کا صوفی ہے، جو اپنی عبادت میں تگ و دو کر رہا ہے۔ اگرچہ اس وقت وہ محض مشکی ہرن کے پاؤں کے نشان پر چل رہا ہے اور یوں اس کا سفر کرنے کا طریقہ منکسرانہ جستجو ہے، مگر علم کی پیاس ایک دن ضرور اس کو اس مقام تک لے جائے گی، جہاں مشکِ نافہ ہرن کے پاؤں کے نشانات سے بہتر رہنما ہوگی۔ یہی شے اس کے قدرت پر غلبے میں اضافے کا باعث ہوگی اور اس کو کلی لامتناہی کی وہ بصیرت حاصل ہوگی جس کی فلسفے کو تلاش ہے، مگر اس کو

وہ پا نہیں سکتا۔ بصیرت کے بغیر قوت، تخریب کاری اور انسان دشمنی بن جاتی ہے۔ انسان کی روحانی وسعت کے لیے، دونوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔''

(3) Vahid, S.A., (Editor), Thoughts and Reflections of Iqbal, Lahore, 1973. Pp.278-279 Urdu Translation of the Extracts, by Latif Ahmad Sherwani is as under:-

سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان جلیل القدر ہستیوں کی غایت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے دنیائے اسلام میں تین مخصوص قوتوں کو حکمران پایا اور ان قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کے لیے اپنی پوری قوت کو مرتکز کر دیا۔

ا۔ ملائیت: علماء ہمیشہ اسلام کے لیے ایک قوت عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوال بغداد کے زمانے سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کے لیے حوصلہ افزا تھی درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے اس جمود کے خلاف، پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

۲۔ تصوف: مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں جس نے عوام کی قوت عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اسی نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصر جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی اس روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

۳۔ ملوکیت: مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی شہید کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔''

خطبۂ الٰہ آباد......ایک نئی تشکیل

اقبال نے یہ خواب دیکھا تھا کہ اسلامیانِ ہند کی مجوزہ آزاد اور خود مختار مملکت میں اسلام کو عرب شہنشاہیت کی زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے گا، دُنیائے اسلام کا انجماد ٹوٹے گا اور یوں اسلام کی حرکی اور انقلابی روح بیدار اور سرگرمِ کار ہو سکے گی۔ ہم نے گزشتہ نصف صدی کے دوران عرب ملوکیت کی چھاپ سے اسلام کو پاک کرنے کی بجائے اس چھاپ کو اور زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نہ تو ہم اُس حقیقی اسلام کی بازیافت کر پائے ہیں اور نہ ہی اسلام کے قانون، تعلیم اور کلچر کو تحریک دے کر اسلام کی حقیقی روح کو روحِ عصر سے ہم آہنگ کر پائے ہیں۔ ہماری اس غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وطنِ عزیز مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ تشدد کی گرفت میں پڑا سسکتا ہے۔ اسلام کی بجائے ملائیت سے پھوٹنے والے اس جنون اور تشدد کا علاج فکرِ اقبال میں موجود ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی ہماری قومی زندگی میں فکرِ اقبال سے انحراف کی صدی ہے۔ انحراف سے اثبات کی جانب ہمارا سفر سن ۱۹۳۰ کے خطبہ الٰہ آباد سے شروع ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ہماری سیاسی اور فکری تاریخ کی اس اہم ترین دستاویز ہی سے پاکستان کا تصور پھوٹا تھا۔

تاریخی پس منظر

ہر چند تصورِ پاکستان کی جڑیں اسلامی ہند کی تاریخ میں دور، بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں تاہم اگر اپنی آسانی کی خاطر ہم کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس

منعقدہ ۱۹۳۰ء سے صرف دس سال پہلے کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمارے لیے اقبال کے خطبۂ الہ آباد کے فوری محرکات کو سمجھنے میں آسانی بھی پیدا ہو جائے گی اور اس خطبہ کے بے مثال قبولِ عام کا راز پانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اقبال نے اپنے اس خطبہ کے ابتدائی حصے میں ایک ایسی بات کہہ رکھی ہے جس کی جانب اب تک توجہ نہیں دی گئی۔ انھوں نے کل ہند مسلم لیگ کے کارپردازان کا شکریہ ادا کرتے وقت کہا تھا:-

"To address this session of the All-India Muslim League you have selected a man who is not despaired of Islam as a living force for freeing the outlook of man from its geographical limitations, who believes that religion is a power of the utmost importance in the life of individuals as well as States, and finally who believes that Islam is itself a Destiny and will not suffer a destiny. Such a man cannot but look at matters from his own point of view." (P.165)

اقبال کا یہ کہنا کہ وہ ایک ایسے شخص ہیں جو اسلام سے مایوس نہیں ہیں اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ ہندوستان میں باقی ماندہ مسلمان قائدین اسلام کے اجتماعی مقدر سے مایوس ہیں۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے۔ انگریز کے پروردہ موروثی سیاستدان تو انگریز ہی کی سنتے اور مانتے تھے اس لیے انھیں یہاں زیرِ بحث لانا کارِ لاحاصل ہے۔ میں یہاں صرف مذہبی سیاسی پارٹیوں اور علمائے دین کی اکثریت کی

بات چھیڑوں گا۔ بیشتر مذہبی سیاسی جماعتیں تو کانگرس کی حلیف تھیں ہی مگر وہ جو کانگرس پر ہندو اجارہ دار سرمایہ داری سے خائف سوشلسٹ علما، تھے وہ بھی اسلام کے اجتماعی مسلک سے روگرداں ہو چکے تھے۔ اس کی ایک مثال مولانا عبیداللہ سندھی ہیں جنہوں نے بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہندوستانی منزل استنبول سے ریاستہائے متحدہ ہندوستان کا جو منشور شائع کیا تھا اُس کے ٹائٹل پر اقبال کے ترانہ انقلاب میں سے ایک شعر بھی درج کیا تھا اور یہ اعلان بھی کہ اس منشور کا پان اسلامزم قسم کے کسی اتحاد اسلامی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھوں نے ٹائٹل ہی پر یہ اعلان کرنا بھی ضروری سمجھا تھا کہ وہ اور اُن کی مجوزہ پارٹی کے اراکین انڈین نیشنل کانگرس کے دائرے میں رہ کر اپنے سیاسی عمل کو آگے بڑھائیں گے۔ پھر جب قراردادِ پاکستان کے صرف ایک سال بعد انھوں نے ''جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی'' قائم کی تو اُس کے منشور میں بھی یہ اعلان کیا تھا کہ اُن کی جماعت صرف لسانی قومیت پر ایمان رکھتی ہے۔ چنانچہ اُن کے خیال میں ہر لسانی گروہ ایک الگ تہذیبی اور جغرافیائی وحدت ہوگا اور یہ درجنوں لسانی اور جغرافیائی وحدتیں مل کر ایک کل ہند وفاق کی صورت اختیار کر لیں گی۔ ایک ایسے زمانے میں جب مسٹر اور مُلا ہر دو اسلام کے اجتماعی مقدر سے روگردانی کر چکے ہیں، اقبال کا یہ اعلان کہ اسلام اپنا مقدر آپ ہے اور وہ اسلام کے اس مقدر سے مایوس نہیں ہیں اسلامیانِ ہند کی تاریک زندگی میں روشنی کی ایک کرن ثابت ہوا۔ اسلامی ہند کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد کی پذیرائی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عبدالحمید علوی کے مضمون میں دیے گئے اس اقتباس پر غور کریں:-

"The decade of twenties is regarded by the historians as pace-setter for the events which followed in the thirties and forties on the political scene in India. The

decade began with the demonstration of unprecedented harmony in the Hindu-Muslim relations but as it unfolded itself the harmony was replaced by conflict and conflagration. Soon the two communities stood wide-apart never to unite again. The rise of Hindu extremism under the banner of Mahasabah and Arya Smaj had come to stay. It questioned the newly established tradition of separate electorate for Muslims and their right to live and flourish within the folds of Islamic culture. Worst still the Indian National Congress, threatened by the ever increasing popularity of Mahasabah among Hindu masses, was beginning to yield to the demands of extremist politics. By 1927 it had acquired many a stances of the Mahasabah, and a year later in the constitutional structure proposed by Pandit Moti Lal Nehru and adopted by Congress despite the strongest possible Muslim opposition, the views of

Mahasabah about Muslim separatism were eminenty reflected. The Round Table Conference of 1930 was of no solace to Muslims either: it too echoed the Motil Lal formula which had practically denied safeguards to the Muslim minority in the future constituional structure of India."

یہاں اگر ۱۹۲۲ء میں بھڑک اُٹھنے والی مالا بار کے مسلمانوں کی بغاوت کا تذکرہ بھی کر دیا جائے تو تصویر بڑی حد تک مکمل ہو جائے گی۔ برطانوی پولیس نے مالا بار میں خلافت تحریک کے ایک رہنما اور اُس کی بیوی کو سرِ بازار کوڑے مار مار کر بے جان کر دیا۔ اس پر مالا بار کے مسلمان برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت پر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے تھانوں کو آگ لگا دی اور برطانوی افسر شاہی کو مار مار کر علاقے سے بھاگ اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سلطنتِ برطانیہ کو اس علاقے میں اپنا اقتدار بحال کرنے میں ایک لمبے عرصے تک سر توڑ کوشش کرنا پڑی۔ جب انگریز اقتدار دوبارہ قائم ہو گیا تو ہندوؤں نے ''مالا بار کی خونی داستان'' کے سے کتابچوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہندوؤں پر تشدد کے جھوٹے واقعات بیان کر کے برطانوی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنا چاہی۔ انڈین نیشنل کانگرس نے اپنے چند مسلمان اراکین پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی جانب سے دیے گئے الزامات سے بری الذمہ قرار دے دیا۔ کانگرس نے اس تحقیقاتی رپورٹ کو رد کر دیا اور یوں مالا بار سے مسلمانوں کو جلا وطن کر دینے کے برطانوی اقدامات کی تائید و حمایت کی پالیسی اپنائی۔ تقریباً سبھی مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ مالا بار کے مسلمانوں کی یہ بغاوت اور اس بغاوت کے ضمن میں اپنائی گئی کانگرسی پالیسی نے تحریکِ خلافت کے زمانے کے ہندو مسلم اتحاد کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

اتحاد کے ختم ہونے کے بعد برطانوی حکومت کی مسلمان کش پالیسی کے باعث ہندوستان کے مسلمان انتہائی مایوسی اور فکری انتشار کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُن کی سیاسی زندگی میں قیادت کا فقدان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ایک منتشر، بے یار و مددگار اور بے سمت ہجوم بن کر رہ گئے تھے۔ اُن کی ساری سیاسی جدوجہد غالب اور جارحیت پسند اکثریت سے آئینی تحفظات کی بھیک مانگنے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس تیرہ و تار فضا میں جب اقبال کی خودی میں سرشار آواز گونجی کہ ہندوستان کے مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک الگ قوم ہیں تو عوامی سطح پر تاریکیاں چھٹ سی گئیں۔

اقبال کا تصورِ پاکستان

پاکستان کا تصور اپنے قومی وجود سے محبت اور دوسروں کے قومی وجود کے احترام سے عبارت ہے۔ سن ۱۹۳۰ کے خطبہ الہ آباد میں اقبال نے بڑے دوٹوک انداز میں اس حقیقت کا انکشاف فرمایا تھا کہ برطانوی ہند ایک ملک نہیں بلکہ ایک برصغیر ہے۔ اس برصغیر کی جغرافیائی وحدت ایک سامراجی وحدت ہے جسے سلطنتِ برطانیہ کی سنگینوں کے زور پر اوپر سے مسلط کیا گیا ہے۔ برطانوی ہند ایک مُلک کا نام نہیں بلکہ کئی ممالک کے مجموعے کا نام ہے۔ ان میں سے ہر ملک میں ایک قوم آباد ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب برطانوی حکومت اپنا بوریا بستر سمیٹ کر واپس انگلستان جا براجے اور ہندوستان کی تمام قوموں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے ماضی اور اپنی اپنی تاریخی اور تہذیبی روایات کے مطابق آزادی اور خودمختاری کی فضا میں زندگی بسر کر سکیں۔ برصغیر کی ان متعدد اقوام میں سے ایک قوم ہم ہندی مسلمانوں کی بھی ہے۔ ہم ہندی مسلمان جدید معنوں میں ایک قوم ہیں اور ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم اپنے لیے ایک الگ وطن کے قیام کا مطالبہ کریں۔ اس موقع پر اقبال نے ہندوؤں کو یہ یقین دہانی کرانا ضروری سمجھا تھا کہ:-

"Nor should the Hindus fear that the creation of autonomous Muslim States will

mean the introduction of a kind of religious rule in such States. The truth is that Islam is not a church. It is a State conceived as a contractual organism long before Rousseau ever thought of such a thing and animated by an ethical ideal which regards man not as an earth-rooted creature, defined by this or that portion of the earth, but as spiritual being understood in terms of a social mechanism and possessing rights and duties as a living being in that mechanism." (P-172).

اسلام کے وسیع النظر، صلح کل اور انسان دوست سیاسی و معاشرتی مسلک پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ:-

"A community which is inspired by feelings of ill-will towards other communities is low and ignoble. I entertain the highest respect for the customs, laws, religious and social institutions of other comunities. Nay, it is my duty according to the teaching of the Quran, even to defend their places of worship, if need be. Yet I love the communal group which is the

source of my life and behaviour and which has formed me what I am by giving me its religion, its literature, its thought, its culture and thereby recreating its whole past as a living operative factor in my present consciousness." (P-169).

ایک سچا مسلمان آدمیت، احترام آدمی کے مسلک پر اس حد تک کاربند ہوتا ہے کہ وہ وقت آنے پر دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت میں اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار رہتا ہے۔ وہ ہر آن صفاتِ خداوندی کو اپنی ذات میں جذب کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ذات میں ہر کسی پر، مذہب وملت کے اختلاف سے قطع نظر، صرف شفقت ومحبت کی نظر ہی ڈالتا ہے:-

بندۂ حق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

ہر مذہب وملت کے وابستگان کے اس احترام کے باوجود وہ اپنے دین، اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کے زندہ عناصر پر ہمیشہ ناز کرتا ہے۔ اسلامیانِ ہند ان زندہ عناصر کو اپنی شخصیت میں فعال اور سرگرمِ کار رکھنے کی خاطر اپنی اکثریت کے علاقوں میں آزاد اور خودمختار ریاستوں کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ خطبہ الہ آباد کا غور سے مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قیامِ پاکستان کا مطالبہ نفرت کی بنیاد پر ہرگز نہیں بلکہ سراسر محبت کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد میں قیامِ پاکستان کو ہندوستان اور اسلام ہردو کے لیے باعثِ خیر وبرکت ٹھہرایا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ پاکستان کے قیام سے ہندوستان میں اندرونی توازنِ اقتدار قائم ہوگا اور اس توازنِ اقتدار سے ہندوستان کے اندر امن قائم ہوگا اور ہندوستان کی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی۔ ساتھ ہی ساتھ

اسلام کو یہ موقع نصیب ہوگا کہ وہ شہنشاہیت کی چھاپ سے خود کو پاک کر کے اپنی ابتدائی سادگی اور پاکیزگی کی بازیافت کر سکے۔ شہنشاہیت نے اسلامی قانون، اسلامی تعلیم اور اسلامی کلچر کو منجمد کر رکھا ہے۔ پاکستان اسلام کی ایک ایسی تجربہ گاہ بن سکے گا جہاں شہنشاہیت کے زیر اثر پیدا ہونے والا انجماد ٹوٹ جائے گا اور قانون، تعلیم اور کلچر کی دنیا ئیں حرکت و عمل سے آشنا ہوں گی۔ اس طرح پاکستان میں اسلام کی حقیقی روح کو از سر نو دریافت کر کے روحِ عصر کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے گا:۔

"I therefore demand the formation of a consolidated Muslim State in the best interest of India and Islam. For India it means security and peace resulting from an internal balance of power; for Islam an opportunity to rid iteself of the stamp that Arabian imperialism was forced to give it, to mobilize its law, its education, its culture, and to bring them into closer contact with its own original spirit and with the spirit of modern times."(P.173)

اقبال کا خواب یہ تھا کہ اسلامیانِ ہند کی مجوزہ آزاد اور خود مختار مملکت میں اسلام کو عرب شہنشاہیت کی زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے گا، دُنیائے اسلام کا انجماد ٹوٹے گا اور یوں اسلام کی حرکی اور انقلابی روح بیدار اور سرگرم کار ہو سکے گی۔ اقبال نے تصورِ پاکستان پیش کرنے کے صرف ایک سال بعد کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے وقت نوجوانوں کو مغرب کے استحصالی اقتصادی نظاموں کو رد کر دینے کا درس دیتے وقت قرآن کی حکمت کی جانب یوں متوجہ کیا تھا:۔

"The faith which you represent recognises the worth of the individual, and disciplines him to give away his all to the service of God and man. Its possibilities are not yet exhausted. It can still create a new world where the social rank of man is not determined by his caste or colour, or the amount of dividend he earns, but by the kind of life he lives; where the poor tax the rich, where human society is founded not on the equality of stomachs but on the equality of spirits, where an Untouchable can marry the daughter of a king, where private ownership is a trust and where capital cannot be allowed to accumulate so as to dominate the real producer of wealth. This superb idealism of your faith, hower, needs emancipation from the medieval fancies of theologians and legists."(P.213).

اپنی عہد آفریں شعری تخلیق ''جاوید نامہ'' میں بھی اقبال نے اشتراکیت اور سرمایہ داری ہر دو نظاموں کو ''یزداں ناشناس اور آدم فریب'' قرار دیتے ہوئے دنیائے انسانیت کو اسلام کی ابتدائی سادگی اور پاکیزگی کی جانب متوجہ کیا ہے۔ انہوں نے یہاں بھی اسلام کی حقیقی روح کو از سرِ نو دریافت کر کے اپنے زمانے کی روح سے

ہم آہنگ کرنے کا درس دیا ہے۔ اگر ہم نے قیامِ پاکستان کے بعد ملائیت کی بجائے اقبال کے تصورِ اسلام پر عمل کرنا شروع کر دیا ہوتا تو آج ہم مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ وارانہ تشدد کی لپیٹ میں ہرگز نہ ہوتے۔ آج بھی اقبال ہم سے یہی چاہتے ہیں کہ ہم باہم برسرِ پیکار مذاہب فقہ کی بجائے حقیقی اسلام کی جانب رجوع کریں۔ اس کام کی ابتدا اُن تخیلات اور احساسات کی زنجیریں توڑ کر ہی کی جا سکتی ہے جن میں ہمارے قدیم فقہا نے اسلام کو جکڑ بند کر کے منجمد کر دیا ہے۔ آج وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ہم اجتہاد کی راہ اپنا کر اس انجماد کو توڑ دیں تاکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی ہر آن آگے بڑھتے ہوئے وقت کے ساتھ قدم ملا کے چل سکے۔

ہم نے گزشتہ نصف صدی کے دوران عرب ملوکیت کی چھاپ سے اسلام کو پاک کرنے کی بجائے اس چھاپ کو اور زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نہ تو ہم حقیقی اسلام کی بازیافت کر پائے ہیں اور نہ ہی اسلام کے قانون، تعلیم اور کلچر کو تحریک دے کر اسلام کی حقیقی روح کو روحِ عصر سے ہم آہنگ کر پائے ہیں۔ ہماری اس غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وطنِ عزیز مذہبی فرقہ واریت کے جنون اور فرقہ وارانہ تشدد کی گرفت میں ہے۔ اسلام کی بجائے ملائیت سے پھوٹنے والے اس جنون اور تشدد کا علاج فکرِ اقبال میں موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم فکرِ اقبال کو عملی جامہ پہنائیں تاکہ اسلام کی وسیع النظر اور انسان دوست روح ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کارفرما ہو سکے۔

تصورِ پاکستان: اسلام یا سیکولرزم؟

آج کل ہماری قومی زندگی میں اس سوال پر بحث کا بازار گرم ہے کہ کیا پاکستان کا تصور ایک اسلامی مملکت کا تصور تھا یا ایک سیکولر سٹیٹ کا۔ یہ بحث مجھے اس اعتبار سے غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تصورِ پاکستان کے خالق علامہ محمد اقبال نے سن ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد میں اس بحث کو غیر ضروری قرار دے دیا تھا۔ علامہ اقبال نے حیرت انگیز پیش بینی کے ساتھ اپنے خطبہ میں یہ سوال اُٹھایا تھا اور پھر اس کا مدلل

جواب دے دیا تھا۔ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ اُن کے زمانے کے مسلمان نوجوانوں نے سیکولرزم کا تصور یورپ سے مستعار لیا ہے۔ اسلام میں اس طرح کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہیں۔ اقبال کے نزدیک سیکولرزم کا تصور یورپ کے مخصوص تاریخی تجربات سے پھوٹا ہے۔

یورپ کی تاریخ کے ایک خاص دور میں پادریوں نے اپنے لیے خدائی حق حکمرانی کا دعویٰ کر کے حکومت پر قبضہ کرلیا اور یوں وہ بہ یک وقت پادری اور بادشاہ بن بیٹھے۔ اس نظام حکومت کو تھیا کریسی کا نام دیا گیا۔ اس نظام کے تحت حکمرانی کے خدائی حق کے دعویدار پادریوں نے عوام پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے اور عیسائیت کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس سنگین صورتِ حال کے خلاف مارٹن لوتھر نے اپنی احتجاجی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک نے بتدریج زور پکڑا اور یوں پادریوں کے حق حکمرانی یعنی تھیا کریسی کو باطل ثابت کرتے ہوئے زندگی کو دو دائروں میں بانٹ کر رکھ دیا گیا۔ یہ دائرے سیکولر اور سیکرڈ یعنی مادی اور روحانی زندگی کے دو الگ الگ دائرے تھے۔ دُنیاوی زندگی کے سیکولر دائرے میں بادشاہوں کا حق حکمرانی تسلیم کیا گیا اور دینی زندگی کے دائرے کو کلیسا تک محدود کر کے پادری کی روحانی حکمرانی کو تسلیم کرلیا گیا۔ زندگی کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دینے کے اس عمل نے عیسائیت کو فقط رہبانیت تک محدود کر کے رکھ دیا۔

جب یورپ میں عیسائیت کو ایک خالصتاً راہبانہ نظام بنا کر رکھ دیا گیا تو ترکِ دُنیا کا وہ تصور پیدا ہوا جو بالآخر دین اور دُنیا، کلیسا اور ریاست اور مادی زندگی اور روحانی زندگی کو دو الگ الگ اور باہم متصادم حصوں میں بانٹ دینے کا سبب بنا۔ اسلام میں اس طرح کی کسی ثنویت کا تصور موجود نہیں ہے، نہ ہی اسلامی تاریخ میں کبھی تھیا کریسی یعنی علماء کے خدائی حق حکمرانی کا کوئی تصور موجود تھا۔ نتیجہ یہ کہ سیکولرزم کا تصور مسلمانوں میں پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر خدانخواستہ مسلمانوں کی تاریخ میں تھیا کریسی قائم ہوگئی ہوتی تو پھر اُس کے خلاف ردِعمل اور ردِعمل کے نتیجے میں سیکولرزم

کے پیدا ہونے کا امکان بھی ہو سکتا تھا۔ یورپ میں تھیا کریسی قائم ہوئی اس کے خلاف مارٹن لوتھر نے اصلاحِ دین کی تحریک چلائی اور اس تحریک کی کامیابی نے بالآخر عیسائی دُنیا میں مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے فقط فرد کی نجی زندگی تک محدود کر دیا۔ اس کے برعکس اسلام ایک اجتماعی نظامِ حیات ہے۔ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور انسان کو اس مادی دُنیا میں زندہ رہ کر اور مادی سرگرمیوں میں مشغول رہ کر روحانی سربلندی کی راہ اپنانے کا درس دیا گیا ہے۔ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال نے کہا ہے کہ:-

"To Islam matter is spirit realising itself in space and time."

اور

"All that is secular is sacred in the roots of its being."

اقبال نے اپنے سامعین کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس بحث کو فقط نظریاتی بحث نہ سمجھیں بلکہ اس کی عملی معنویت کو پیشِ نظر رکھیں کیونکہ سیکولرزم یا اسلام کے اس سوال کے درست جواب پر ہی برصغیر میں مسلمانوں کی منفرد تہذیبی ہستی کی بقا کا انحصار ہے!

علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد کے آغاز میں ہی یہ سوال اُٹھایا تھا کہ کیا مذہب ایک نجی معاملہ ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو فقط ایک اخلاقی نظام کے طور پر باقی رکھیں مگر اس کے سیاسی نظام کو متحدہ ہندوستانی قومیت کی تعمیر کی خاطر ترک کر دیں؟ اقبال کے نزدیک یہ سوال برطانوی ہند میں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کے پیشِ نظر اور بھی زیادہ سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یورپ میں عیسائیت کو ایک خانقاہی نظام کی صورت دے کر مادی زندگی کو روحانی زندگی سے الگ کر دیا گیا۔ وہاں نیکی کا مفہوم ترکِ عمل اور ترکِ دُنیا سے عبارت ہو کر رہ گیا۔ اس لیے یورپ کے لوگ

مذہب کو فرد کا نجی معاملہ قرار دے کر سیاسی و اقتصادی اور معاشرتی و تہذیبی نظاموں کو مذہب کے دائرہ کار سے باہر قرار دیتے ہیں تو یہ بات قابلِ فہم ہے مگر مسلمانوں میں اس طرح کی سوچ ناقابلِ فہم ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہاں دین اور دنیا دو الگ الگ اکائیاں نہیں ہیں بلکہ دین اور دنیا دونوں کا ایک ہی عالم ہے۔ اس لیے:-

> "The religious ideal of Islam, therfore, is organically related to the social order which it has created. The rejection of the one will eventually involve the rejection of the other. Therefore the construction of a polity on national lines, if it means a displacement of the Islamic principle of solidarity, is simply unthinkable to a Muslim. This is a matter which at the present moment directly concerns the Muslims of India."

یہاں اقبال نے دو باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ کی ہیں۔ اول یہ کہ: اسلام کا اخلاقی مسلک، اسلام کے سیاسی مسلک کے ساتھ نامیاتی طور پر مربوط ہے یعنی اخلاقی اور سیاسی ہر دو آئیڈیلز یک جان اور یک قالب ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آج ہم متحدہ ہندوستانی قومیت کی تعمیر کی خاطر اسلام کے سیاسی مسلک کو چھوڑ دیں گے تو بالآخر ہمیں اسلام کا اخلاقی مسلک بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ یہ گویا ترکِ اسلام کی راہ ہو گی۔ دوم یہ کہ: ہندی مسلمان یہ راہ ہرگز نہ اپنائیں گے اس لیے ہندو مسلمان متحدہ قومیت کا خواب کبھی

شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

اسلامی اخوت و مساوات کے تصورات نے کسی ایک فرد یا کسی ایک گروہ کو حکمرانی کا حق ہرگز نہیں دیا۔ حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری۔ اللہ میاں نے اپنا حق حکمرانی اپنے تمام بندوں کو یکساں طور پر منتقل کر رکھا ہے۔ یہ حق مسلمان معاشرے کا ہر فرد خود ہی استعمال کرتا ہے۔ یہاں علمائے کرام خود کو عامۃ المسلمین کی اجتماعی رائے کے سامنے پیش کرنے کا حق تو رکھتے ہیں مگر محض برگزیدہ عالم دین ہونے کی حیثیت سے انھیں خدا کی طرف سے حکمرانی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے یعنی جدید سیاسی اصطلاحات کی روشنی میں مسلمان معاشروں میں تھیاکریسی کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہیں ہے۔ سلطانیٔ جمہور کے یہ اسلامی تصورات جمہوری نظامِ سیاست کی تائید کرتے ہیں۔ برطانوی ہند میں مسلمان تعداد میں کم ہیں اور ہندو تعداد میں اُن سے کہیں زیادہ ہیں اس لیے اُن کی جداگانہ مسلمان شناخت کا قائم رہنا بے حد دشوار ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے اُن کے لیے الگ مملکت کا قیام ضروری ہو گیا ہے۔ عصرِ رواں میں یہ الگ مملکت صرف قوموں کے حق خود اختیاری کی بنیاد پر ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ اس لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے فلسفیانہ استدلال کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک الگ قوم ثابت کر دکھایا۔

اقبال نے ہندی مسلمانوں کو جدید معنوں میں ایک قوم قرار دیا۔ انھوں نے اپنے ہم عصر فرانسیسی مفکر ارنسٹ رینان کا حوالہ دیتے ہوئے روحانی ہم آہنگی کو قومیت کی تشکیل و تعمیر کی بنیاد ٹھہرایا۔ انھوں نے کہا کہ قدیم زمانے میں جب انسان ابھی تہذیب و شائستگی کے اولیں مراحل طے کرنے میں مصروف تھا جغرافیائی اور نسلی بنیادوں پر قومیں وجود میں آتی تھیں مگر آج قومیں اپنے روحانی تصورات کے اشتراک اور اپنے تصورِ کائنات کی یکسانیت کی بنیاد پر بنتی ہیں۔ آج کا انسان جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر روحانی یگانگت کو اپنی پہچان قرار دیتا ہے۔ ہندوستان میں

اسلام نے مسلمانوں کو ایک الگ تہذیبی شناخت بخشی ہے اور اسی جداگانہ تہذیبی شناخت نے انھیں ایک الگ قوم بنا دیا ہے۔ اپنے استدلال پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:-

> "The life of Islam as a cultural force in this country very largely depends on its centralisation in a specified territory. This centralisation of the most living portion of the Muslims of India, will eventually solve the problem of India as well as of Asia."

اقبال نے اس سنگین صورتِ حال کا حل ایک جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر مسلمان اکثریت کے علاقوں میں جداگانہ مسلمان ریاستوں کے قیام کی صورت میں پیش کیا۔ سن ۱۹۳۰ میں اقبال نے اپنے اسی خطبہ الہ آباد میں بڑے اعتماد کے ساتھ یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ برصغیر کے شمال مغرب میں ایک جداگانہ مسلمان مملکت کا قیام مقدر ہو چکا ہے۔ اقبال نے اسلامیانِ ہند کو اپنی تہذیب کی بقا اور ترقی کی خاطر ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرنے کا جو راستہ دکھایا تھا اُسے اپنا کر اسلامیانِ ہند نے بالآخر پاکستان اور بنگلہ دیش کی صورت میں دو جداگانہ مسلمان ریاستیں قائم کر دیں۔ پاکستان جس جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا قیام پاکستان کے بعد اُس نے قدرتی طور پر پاکستانی قومیت کا نام پایا۔

جداگانہ مسلمان قومیت اور اہلِ کتاب

علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد میں جداگانہ مسلمان قومیت پر ممکنہ اعتراضات کا اطمینان بخش جواب بھی دے رکھا ہے۔ اسلامیانِ ہند کو مخالفین کی جانب سے پھیلائے جانے والے فکری انتشار سے خبردار کرتے ہوئے اقبال خود ہی یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ جب ترکی اور ایران جیسے ممالک جغرافیائی قومیت کے تصور سے کوئی

خطرہ محسوس نہیں کرتے تو پھر ہندی مسلمان اس تصور سے کیوں خائف ہیں:۔

"Nor should the Muslim leaders and politicians allow themselves to be carried away by the subtle but placid arguments that Turkey and Iran and other Musiim countries are progressing on national, i.e., territorial lines. The Muslims of India are differently sistuated. The countries of Islam outside India are practically wholly Muslim in population. The minorities there belong, in the language of the Quran, "to the people of the Book". There are no social barriers between Muslims and the "people of the Book". A Jew or a Christian or a Zoroastrian does not pollute the food of a Muslim by touching it, and the law of Islam allows intermarriage with the "people of the Book" Indeed the first practical step that Islam took towards the realisation of a final combination of humanity was to call upon peoples possessing practically the same ethical ideal to come forward and combine." (P-190)

علامہ اقبال اس سوال کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ترکی اور ایران کے سے

ممالک میں مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی ہستی کے مٹ جانے کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے کیونکہ ان ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور یہاں کی اقلیتیں اہل کتاب پر مشتمل ہیں۔ ہندوستان کے برعکس ان ممالک میں مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان معاشرتی دیواریں نہیں کھڑی کی گئیں۔ یہودی، عیسائی، زرتشتی اور مسلمان چھوت چھات کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے کھانے کو چھو کر ناپاک نہیں کرتا بلکہ اسلام کے قوانین اہل کتاب کے درمیان شادی بیاہ تک کو جائز ٹھہراتے ہیں۔ اس اعتبار سے ترکی اور ایران کے سے ممالک کی ساری آبادی عملاً مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس The Muslims of India are differently situated. اقلیت میں ہونے کے باعث وہ اُس ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں جو انسانی عدم مساوات پر عقیدۃً عمل پیرا ہے۔ اس لیے اُن پر لازم آتا ہے کہ وہ ایک جداگانہ مسلمان قومیت کا تصور اپنا کر ایک الگ اور خود مختار قومی وطن حاصل کریں۔

اپنے استدلال کو قرآن حکیم کی روشنی میں آگے بڑھاتے ہوئے اقبال ہمیں اُس آیہ کریمہ کی جانب متوجہ کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام اہل کتاب کو یہ دعوت دی ہے کہ وہ اُس کلمہ یعنی توحید کی بنیاد پر متحد ہو جائیں جو اُن کے درمیان مشترک ہے۔ اہل کتاب کے اس اتحاد کو اقبال پوری انسانیت کے اتحاد کی جانب پہلا قدم قرار دیتے ہیں اور گہرے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ:-

"The wars of Islam and Christianity, and later, European aggression in its various forms, could not allow the infinite meaning of this verse to work itself out in the world of Islam. To-day it is being gradually realised in the countries of Islam

in the shape of what is called Muslim Nationalism."(P-190).

ماضی میں صلیبی جنگوں اور بعد ازاں اسلامی ممالک کے خلاف یورپ کی کثیر جہتی جارحیت کے باعث مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان مشترک قومیت کا یہ تصور حقیقت کی شکل اختیار نہ کر سکا۔ آج انسانی اتحاد کا یہ مرحلہ اول مسلمان ممالک میں مسلم قومیت کی شکل میں سامنے آنے لگا ہے۔ خطبہ الہ آباد کی روشنی میں غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندو اور مسلمان تو اپنے باہم متصادم تصورِ کائنات کی بنیاد پر بے شک دو الگ الگ قومیں ہیں مگر مسلمان اور اہل کتاب ایک ہی قوم ہیں اور مسلمانوں اور اہلِ کتاب کا توحید کی بنیاد پر یہ اتحاد ایک وسیع تر انسانی اتحاد کا پہلا مرحلہ ہے۔

تصورِ پاکستان اور سرزمینِ پاکستان

اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد میں جہاں اپنے تصورِ پاکستان کے فکری اور نظریاتی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے وہاں وہ تصورِ پاکستان کی جغرافیائی بنیاد کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے لائے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اقبال وطن سے محبت کو جزوِ ایمان تسلیم کرنے کے باوجود اتحادِ انسانی کا بنیادی سیاسی اصول نہیں مانتے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی مصطفوی شناخت کو ہی اُن کی اصل شناخت قرار دیا ہے۔ آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ است اور اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔ بجا اور درست مگر اس کے ساتھ ساتھ اقبال وطنی اشتراک کو اگر وہ روحانی یگانگت کے منافی نہ ہو تو بہت اہمیت دیتے ہیں اقبال نے اپنے اسی خطبۂ الہ آباد میں اُس خطۂ زمین کو جسے آج پاکستان کہا جاتا ہے ایک الگ جغرافیائی اور تہذیبی وحدت کا نام دیا ہے۔ وادیٔ سندھ کی جداگانہ شخصیت پر روشنی ڈالتے وقت اقبال فرماتے ہیں کہ:۔

"In point of life and civilization the Royal Commissioners find it more akin to

Mesopotamia and Arabia than India. The Muslim geographer Mas'udi noticed this kinship long ago when he said: "Sind is a country nearer to the dominions of Islam." Sind has her back towards India and face towards Central Asia." (P-186)

یہ خطۂ زمین اپنی زندگی اور تہذیب کے اعتبار سے ہندوستان سے دور مگر بغداد اور دُنیائے عرب سے قریب ہے۔ اسی لیے مسلمان جغرافیہ دان مسعودی نے وادیٔ سندھ کو دُنیائے اسلام کا ایک حصہ بتایا تھا۔ اقبال کا خیال یہ ہے کہ وادیٔ سندھ کا رُخ وسطِ ایشیا کی جانب ہے اور ہندوستان اس کے عقب میں واقع ہے۔ جب اقبال نے ایک آزاد اور خودمختار مسلمان مملکت کے قیام کو اس علاقے کا آخری مقدر قرار دیا تھا تو یہ جغرافیائی پس منظر بھی اُن کے ذہن میں موجود تھا۔

اقبال نے خطبہ الہ آباد میں برطانوی ہند کو ایک ملک کی بجائے ایک برصغیر قرار دیتے ہوئے اسے ایک چھوٹا سا ایشیا قرار دیا تھا اور اسی بنیاد پر کہا تھا کہ جمہوریت کا نظام یہاں اُس وقت تک نافذ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس برصغیر کے مختلف ممالک کو الگ الگ اور خودمختار ریاستوں میں تقسیم نہیں کر دیا جاتا:-

"India is Asia in miniature. Part of her people have cultural affinities with nations in the east and part with nations in the middle and west of Asia." (P-168)

چنانچہ انھوں نے لندن کی پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے نتائج کو بڑی جرأت کے ساتھ رد کرتے ہوئے انگلستان کے وزیراعظم کی ہٹ دھرمی کو درج ذیل الفاظ میں تنقید کا نشانہ بنایا تھا:-

"Yet the Prime Minister of England apparently refuses to see that the problem of India is international and not national. Obviously he does not see that the model of British democracy cannot be of any use in a land of many nations."(P-188)

اقبال نے دوٹوک انداز میں کہا تھا کہ برطانوی وزیراعظم جان بوجھ کر اس حقیقت کے اعتراف سے گریزاں ہیں کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ برطانوی جمہوریت کا ماڈل ہندوستان میں اس لیے کام نہیں دے سکتا کہ یہاں ایک نہیں بلکہ بہت سی قومیں آباد ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ جسے عرف عام میں دوقومی نظریہ کہا جاتا ہے، وہ دراصل کثیر قومی نظریہ ہے۔ اسلامیانِ ہند نے تو اقبال کے تصور کو اپنا کر قائداعظم کی قیادت میں اپنے لیے الگ قومی وطن حاصل کر لیا تھا۔ اب دیکھنا چاہیے کہ برصغیر کی دوسری قومیں اپنی قومی آزادی اور خودمختاری کی جدوجہد میں کب کامیاب ہوتی ہیں؟

تصور اور تحریک

تصورِ پاکستان کو حقیقت میں بدلنے کی تحریک کی قیادت کے لیے علامہ اقبال کی نگاہیں گھوم پھر کر فقط ایک شخص پر آ ٹھہرتی تھیں۔ یہ شخص ہمارے قائداعظم محمد علی جناح تھے اقبال خود کو جن کا ایک ادنیٰ سپاہی قرار دینے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری تین برسوں کے دوران قائداعظم سے اُن کی فکری وسیاسی رفاقت بہت گہری ہو چلی تھی۔ ایک طویل عرصہ تک فکری تنہائی کا سامنا کرنے کے بعد بالآخر علامہ اقبال فکری رفاقت کی نعمت سے فیض یاب ہوئے اور خوشی میں پکار اُٹھے کہ:۔

گئے دِن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب میرے راز داں اور بھی ہیں

زندگی کے آخری دور میں قائداعظم اُن کے سب سے بڑے رازداں تھے
جن سے وہ چپکے چپکے اسلامیانِ ہند کے مقدر پر راز و نیاز میں مشغول رہا کرتے تھے۔
اُس زمانے میں ہر دو بانیانِ پاکستان چونکہ ایک شہر میں نہیں رہتے تھے اس لیے بیشتر یہ
گفتگو خط و کتابت کی زبانی ہوا کرتی تھی۔ دونوں نے آپس میں یہ طے کر رکھا تھا کہ
اُن کی باہمی خط و کتابت صیغۂ راز میں رہے گی۔ اس راز کو قائداعظم نے قرارداد
پاکستان کے دو برس بعد سن ۱۹۴۲ء میں افشا کیا اور Letters of Iqbal to
Jinnah کے عنوان سے اپنے نام اقبال کے چند خطوط شائع کر دیے۔ ۲۸ مئی
۱۹۳۷ء کے خط میں علامہ اقبال انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست کے اسباب سے
بحث بھی کرتے ہیں اور شکست کو فتح میں بدلنے کی راہ بھی دکھاتے ہیں:-

"The League will have to finally decide whether it will remain a body representing the upper classes of Indian Muslims or Muslim masses who have so far, with good reason, taken no interest in it. Personally I believe that a political organisation which gives no promise of improving the lot of the average Muslim cannot attract our masses.

Under the new constitution the higher posts go to the sons of upper classes; the smaller ones go to the friends or relatives of the ministers. In other matters too our political institutions have never

thought of improving the lot of Muslims generally. The problem of bread is becoming more and more acute. The Muslim has begun to feel that he has been going down and down during the last 200 years. Ordinarily he believes that his poverty is due to Hindu money-lending or capitalism. The perception that it is equally due to foreign rule has not yet fully came to him. But it is bound to come. The atheistic socialism of Jawarharlal is not likely to receive much response from the Muslims. The question therefore is: how is it possible to solve the problem of Muslim poverty? And the whole future of the League depends on the League's activity to solve this question. If the League can give no such promises I am sure the Muslim masses will remain indifferent to it as before. Happily there is a solution in the enforcement of the Law of Islam and its further development in the light of modern ideas. After a long and careful study of

Islamic Law I have come to the conclusion that if this system of law is properly understood and applied, at last the right to subsistence is secured to everybody. But the enforcement and development of the Shariat of Islam is impossible in this country without a free Muslim state or states. This has been my honest conviction for many years and I still believe this to be the only way to solve the problem of bread for Muslims as well as to secure a peaceful India. If such a thing is impossible in India the only other alternative is a civil war which as a matter of fact has been going on for some time in the shape of Hindu-Muslim riots. I fear that in certain parts of the country, e.g. N.-W. India, Palestine may be repeated. Also the insertion of Jawaharlal's socialism into the body-politic of Hinduism is likely to cause much bloodshed among the Hindus themselves. The issue between social democracy and Brahmanism is not

dissimilar to the one between Brahmanism and Buddhism. Whether the fate of socialism will be the same as the fate of Buddhism in INdia I can not say. But it is clear to my mind that if Hinduism accepts social democracy it must necessarily cease to be Hinduism. For Islam the acceptance of social democracy in some suitable form and consistent with the legal principles of Islam is not a revolution but a return to the original purity of Islam. The modern problems therefore are more easy to solve for the Muslims than for the Hindus. But as I have said above in order to make it possible for Muslim India to solve the problems it is necessary to redistribute the country and to provide one or more Muslim states with absolute majorities. Don't you think that the time for such a demand has already arrived?" (P.16-19)

اقبال نے اپنے اس خط میں لکھا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلم لیگ یہ فیصلہ کر گزرے کہ وہ بدستور اونچے طبقے کے مسلمانوں کی نمائندہ ہی بنی رہے گی یا مسلمان عوام کے مصائب ومشکلات کے حل کو اپنے پروگرام کا مرکز ومحور بنائے گی۔

اقبال نے دوٹوک اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ اگر اب تک مسلمان عوام نے مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں لی تو اس میں وہ حق بجانب ہیں جب تک مسلم لیگ غریب عوام کے روٹی روزگار کے مسائل کو اپنے سیاسی منشور کا حصہ نہیں بناتی تب تک وہ عوام میں اسی طرح نامقبول ہی رہے گی۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال نے نئے آئین کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ اس آئین کے تحت بلند مناصب تو بالادست طبقے کے بیٹوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں اور کم بلند عہدوں پر وزیروں کے رشتہ داروں اور دوستوں کی اجارہ داری قائم ہوگئی ہے۔ دوسری جانب غریب مسلمانوں کے لیے روٹی کا مسئلہ دن بدن سنگین سے سنگین تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس صورت حال سے فائدہ اُٹھا کر جواہر لال نہرو اپنی بے خدا سوشلزم کے فروغ کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔ اُن کے یہ خواب خود ہندو معاشرہ مٹی میں ملا دے گا۔ اس بے خُدا سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کا اقتصادی نظام زیادہ مؤثر اور مقبول ہوسکتا ہے۔ عہدِ حاضر کے معاشی نظریات کی روشنی میں اسلام کے معاشی نظام کی نئی تشکیل اور نفاذ سے غربت کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے مگر اس سلسلے میں قانون سازی کے لیے ایک الگ مسلمان قانون ساز اسمبلی کا وجود ضروری ہے اور یہ قانون ساز اسمبلی ایک آزاد اور خود مختار مسلمان ملک میں ہی وجود میں آسکتی ہے۔

اپنے خط کے آخر میں اقبال بابائے قوم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا آپ کے خیال میں وہ وقت نہیں آپہنچا جب ہم آزاد اور خود مختار مسلمان مملکت کا مطالبہ پیش کر دیں؟............ تین سال سے بھی کم مدت میں بالآخر وہ وقت آن پہنچا جب اسلامیانِ ہند نے اقبال کے شہر لاہور میں یہ مطالبہ قراردادِ پاکستان کی صورت میں منظور کر ڈالا مگر افسوس کہ اقبال اُس وقت اس دارِ فانی کو خیر باد کہہ کر ہم سے دائماً رخصت ہو چکے تھے۔

....

حواشی

(۱) دو اقتباسات کو چھوڑ کر باقی تمام تر اقتباسات سید عبدالواحد کی مرتبہ اور شیخ اشرف کی ۱۹۶۴ء میں لاہور سے شائع کردہ کتاب Thoughts and Reflections of Iqbal

(۲) Letters of Iqbal to Jinnah شیخ محمد اشرف نے ۱۹۴۲ء میں لاہور سے شائع کی تھی۔ بابائے قوم کے نام علامہ اقبال کے خط کا اقتباس اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔ کتاب کے Foreword میں بابائے قوم حضرت محمد علی جناح نے اعتراف کیا ہے کہ

"It was a great achievement for Muslim League that its lead came to be acknowledged by both the majority and minority provinces. Sir Muhammad Iqbal played a very conspicuous part, though at the time not revealed to public, in bringing about this consummation I think these letters are of very great historical importance, particularly those which explain his views in clear and unambiguous terms on the political future of Muslim India. His views were substantially in consonance with my own and had finally led me to the same conclusions as a result of careful examination and study of the constitutional problems facing India, and found expression in due courese in the united will of Muslim India as adumberated in the Lahore resolution of the All-India Muslim League, popularly known as the "Pakistan Resolution", passed on 23rd March, 1940." (P.6-7).

(۳) جناب عبدالحمید علوی کا مضمون اسلام آباد سے شائع ہونے والے رسالے The Concept کے اپریل اور مئی ۱۹۸۱ء کے شمارہ (صفحات ۵تا۹) میں شائع ہوا تھا۔

اقبال اور اسلامی اتحاد کا جدید تصور

اقبال کے جن تصورات کو بالکل غلط معانی پہنانا ہماری عادت بن چکی ہے اُن میں سے ایک اسلامی اتحاد کا تصور بھی ہے۔ملوکیت کی صدیوں نے ہمارے فکری سانچوں اور جذباتی تلازمات کو آج تک اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔نتیجہ یہ کہ جب ہم درج ذیل شعر پڑھتے ہیں تو بالعموم ہمارے ذہن میں ایک بہت بڑی مسلمان سلطنت کا تصور ابھرتا ہے:-

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا اسلامی اتحاد کے اس سلطانی (Imperialistic) تصور سے صرف اور صرف دشمنی کا رشتہ ہے۔ وہ مسلمان ممالک کو آزاد اور خود مختار اکائیاں قرار دیتے ہیں اور پھر ان ممالک کے آزادانہ اور رضا کارانہ اتحادِ فکر وعمل کا خواب دیکھتے ہیں۔اپنے اس مشہور شعر میں انہوں نے اس بات کو مسلمان ممالک کے باہمی ربط وضبط سے تعبیر کیا ہے:-

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

یہاں اقبال پورے مشرق کی نجات مسلمان قوموں کے رضا کارانہ اتحاد میں دیکھتے ہیں۔اقبال کی نظر میں مسلمان ممالک کا اتحاد مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر

مسلم ممالک کو بھی سامراجی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ضروری ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان ممالک کا اتحاد غیر مسلم دُنیا پر اپنا سامراجی غلبہ قائم کرنے کا خواب نہیں ہے بلکہ سارے کے سارے مشرق کو آزادی کی شاہراہ پر ڈالنا ہے۔ چونکہ غلام مشرق کو سامراجی چنگل سے آزاد کرانے کی ذمہ داری اسلامی مشرق پر عائد ہوتی ہے اس لیے مسلمانوں پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے اندر ایک بار پھر اپنے اسلاف کا قلب وجگر پیدا کریں اور:۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
مُلک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ وخوں، مٹ جائے گا
تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مُقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تُو مانندِ خاکِ رہ گزر

رنگ وخوں کا امتیاز اور نسلی اور جغرافیائی تفاخر انسانی اخوت اور مساوات کے بنیادی اسلامی تصورات کے منافی ہے۔ ان غیر اسلامی اور انسان دُشمن تصورات کو انسانی وحدت کی بنیاد بنا کر یورپ نے خود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور پھر انہی تصورات کی بنیاد پر ایک یورپ میں کئی قومی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ یہ ریاستیں غلبہ اور بالادستی کے جنون میں باہم جنگ وجدل میں مصروف ہو گئیں۔ اس جنگ وجدل کا بنیادی محرک یہ ہے کہ امیروں کو مسلسل امیر سے امیر تر بنانے کی خاطر غریبوں کا مسلسل استحصال روا رکھا جائے۔ اقبال کے نزدیک اسلام اس طرح کی نسلی اور جغرافیائی قوم پرستی کو نوعِ انساں کا بدترین دُشمن قرار دیتا ہے۔ نسلی اور جغرافیائی وطن پرستی کے اِن یورپی تصورات کو مسلمان ممالک میں بھی فروغ پاتے دیکھ کر اقبال اجتہاد کا راستہ

اپناتے ہیں۔ وہ نسلی ،لسانی اور جغرافیائی بنیاد پر تو قومیت کے ہر تصور کو اسلام کے منافی قرار دے کر رد کر دیتے ہیں مگر قومیت کا ایک جدید تصور بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ تصور نسلی ،لسانی اور جغرافیائی عوامل کو خاطر میں لاتا ہے مگر انہیں انسانی وحدت کے بنیادی تصورات نہیں مانتا۔اس کے برعکس وہ دینی اور روحانی یگانگت کو وحدتِ انسانی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ سیاسی نظریہ وعمل کی دُنیا میں اقبال کا اجتہاد یہ ہے کہ روحانی تصورات کے اشتراک کی بنیاد پر قائم ہونے والی قومیت اسلامی قومیت ہے۔قومیت کے اس جدید تصور ہی کی بنیاد پر اقبال نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا اور اسی تصور کی بنیاد پر ترکی میں جدید قومی ریاست کے وجود میں آنے کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور اسے دیگر مسلمان علاقوں میں آئندہ قائم ہونے والی جدید قومی ریاستوں کا پیش خیمہ بتایا:-

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بُوئے گُل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹُوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

یہاں اقبال خلافتِ عثمانیہ کی تباہی کو دُنیائے اسلام کے لیے ایک نئی صبح کا طلوع قرار دیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اُن کی نظر میں یہ خلافت سلطنتِ عثمانیہ کے اندر ایک ملوکیت سے زیادہ کچھ نہ تھی اور سلطنتِ عثمانیہ کے حدود سے باہر رہنے والے مسلمانوں کے لیے فقط ایک علامتی Symbolic Overlordship سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ برطانوی استعمار نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر سلطنتِ عثمانیہ میں نسلی، علاقائی اور لسانی نفرتوں کے بیج بوئے ،نفرت کی اس سیاست کو ہوا دینے کی خاطر مذہبی اور سیاسی رہنما پیدا کیے اور پھر اپنے آلۂ کاران رہنماؤں کی مدد سے سلطنتِ عثمانیہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ ''ہوگئی رُسوا زمانے میں کلاہِ لالہ

رنگ'' اور '' حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے''۔ یہ تو ہوا منفی نتیجہ۔ اس ساری تباہی کا ایک مثبت نتیجہ بھی سامنے آیا اور وہ یہ کہ '' جوانانِ تاتاری'' بے حد '' صاحب نظر نکلے''۔ یوں استعماری قوتوں کا ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دینے کا خواب مٹی میں مل گیا اور مصطفیٰ کمال اتاترک کی قیادت میں ایک جدید قومی ریاست کا قیام عمل میں آ گیا۔ ترکی کی یہ جدید قومی ریاست ایک نئی بشارت ہے۔ اقبال اسے مسلمان قومی ریاستوں کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلامی اتحاد کی شکل ملوکانہ نہیں بلکہ جمہوری اتحاد ہے۔ یہ اتحاد آزاد اور خود مختار مسلمان قومی ریاستوں کی ایک مجلس کی صورت اختیار کر لے گا۔ ترکی میں عثمانی خلافت کی جگہ جدید قومی ریاست کے قیام کا خیر مقدم کرتے وقت اقبال مسلمانوں کو یہ مشورے دیتے ہیں کہ:-

"For the present every Muslim nation must sink into her own deeper self, temporarily focus her vision on herself alone, until all are strong and powerful to form a living family of republics. A true and living unity, according to the nationalist thinkers, is not so easy as to be achieved by a merely symbolical overlordship. It is truly manifested in a multiplicity of free independent units whose recial rivalries are adjusted and harmonized by the unifying bond of a common spiritual aspiration. It seems to me that God is slowly bringing home to us the

truth that Islam is neither Nationalism nor Imperialism but a League of Nations which recognizes artificial boundaries and racial distinctions for facility of reference only, and not for restricting the social horizon of its members."[1]

مسلمان مجلسِ اقوام ..... مسلم لیگ آف نیشنز کا یہ نیا اسلامی تصور مسلمانوں کے اتحاد کے پُرانے ملوکانہ تصور کا بدل ہے۔ اقبال ترکی کی طرح ہر مسلمان قوم کو جدید قومی مرکز پر متحد اور سرگرمِ کار دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان قوم اپنے اپنے قومی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی خودی کو مضبوط بنائے اور یوں حقیقی معنوں میں خودمختار اور طاقتور قوموں کی ایک بین الاقوامی مجلس قائم ہو جائے جو دُنیائے اسلام کے مشترکہ مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کرنے کا فریضہ سرانجام دے۔ پاکستان کا تصور بھی مسلمانوں کی ایک جدید قومی ریاست کے قیام کا تصور ہے۔ اپنی نظم ''طلوعِ اسلام'' میں انھوں نے عہدِ حاضر کے مسلمان کو اُن ابدی انسانی اقدار کی جانب متوجہ کیا ہے دینِ اسلام جن کا علمبردار ہے:-

تُو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خُدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تُورانی
تُو اے شرمندۂ ساحل! اُچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مُرغِ حرم! اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آ جائے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

بے انتہا علم اور بے پایاں محبت سے پھوٹنے والی درج بالا انسانی اقدار کو اقبال مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں سرگرمِ کار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جب تک مسلمان اپنی عملی زندگی میں ان اقدار کو نہیں اپناتے تب تک دُنیا کی امامت کے اسلامی خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہیں گے۔ ماضی کی صدیوں میں جب مسلمانوں نے انسانی تہذیب کے کارواں کی قیادت کا حق ادا کیا تھا اُس وقت اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں یہ اعلیٰ انسانی اقدار زندہ تھیں۔ آج ہمیں اپنے ہاں ان گم شدہ اقدار کو پھر سے تلاش کرنا اور رواج دینا ہے۔ جب مسلمان قومیں ان اقدار پر عمل پیرا ہوں گی تو وہ اپنے اپنے قومی دائروں سے اوپر اُٹھ کر مسلم لیگ آف نیشنز تک آ پہنچیں گے۔ بیک وقت قومی اور بین الاقوامی دائروں میں ان اعلیٰ انسانی اقدار کی جلوہ گری جس اسلامی اتحاد کو وجود میں لائے گی وہ عملاً انسانی اتحاد کا اولیں مرحلہ ثابت ہوگا۔ اقبال نے انہی معنوں میں پان اسلامزم کو پان ہیومنزم قرار دیا ہے۔

دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جاتے ہوئے اقبال نے رسالہ ''بمبئے کرانیکل'' کو ایک انٹرویو میں پان اسلامزم سے متعلق چند سوالات کا جواب بھی دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپی استعمار کے خلاف مسلمانوں کی بیداری اور بغاوت کی

لبرزوروں پر تھی۔ برطانوی استعمار کے ساتھ ساتھ برصغیر کی غیر مسلم قوتیں بھی مسلمانوں کی بیداری اور اتحاد سے خائف تھیں۔ بیداری اور اتحاد کی اس تحریک کو طرح طرح سے بدنام کرنے کے جتن ہو رہے تھے۔ مغربی دُنیا اس بیداری اور اتحاد کو اپنے سامراجی مستقبل کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتی تھی اور اپنی رائے عامہ کو پان اسلامزم کی فکری مذمت اور عملی مزاحمت کے لیے تیار کر رہی تھی۔ ایسے میں جب اقبال سے پان اسلامزم پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے کسی معذرت خواہانہ رویے کو اپنانے کی بجائے دُنیائے اسلام میں بیداری اور اتحاد کی اس تحریک کی مدلل اور مؤثر تحسین فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ پان اسلامزم کے جس تصور کو مغرب میں ایک ڈراؤنا خواب بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اُس کا وجود تو اُس فرانسیسی صحافی کے دماغ کے علاوہ اور کہیں موجود نہیں ہے یہ اصطلاح جس کی اختراع ہے۔ وہ پان اسلامزم جو مغربی استعمار سے مسلمانوں کو آزاد کرانے کی خاطر اُن کی متحدہ جدوجہد کا داعی ہے وہ آج کی ایک حقیقت ہے۔ پان اسلامزم کا یہ تصور سید جمال الدین افغانی کے فکر وعمل سے نمایاں ہے۔ یہ تصور سامراجی یلغار کو روکنے کا ایک دفاعی حربہ ہے اور میں پان اسلامزم کے اس تصور پر یقین رکھتا ہوں۔ اپنے استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال نے بتایا کہ پان اسلامزم کا ایک اور تصور بھی ہے اور وہ یہ کہ اسلام رنگ ونسل کے تمام تر امتیازات کو مٹا ڈالنے کا درس دیتا ہے۔ اس وقت دُنیا رنگ ونسل کے امتیاز اور تفاخر کی بنیاد پر آقا اور غلام کے غیر مہذب اور ناشائستہ مسلک پر قائم ہے۔ یہ مسلک انسانی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اسلام روزِ اول ہی سے ان بتوں کی پرستش سے انکار اور انسانی اخوت ومساوات پر اصرار کرتا چلا آ رہا ہے۔ پان اسلامزم کی یہ شکل درحقیقت پان ہیومنزم ہے۔ اسلامی اتحاد کا یہ تصور جب حقیقت کی شکل اختیار کرے گا تب پتہ چلے گا کہ فی الحقیقت یہ تو انسانی اتحاد ہی کا ایک خوبصورت نام ہے۔ (۲)

مذکورہ بالا انٹرویو کی ایک ایک سطر سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ سامراج دُشمنی اور انسان دوستی ہی عہدِ حاضر میں اسلامی اتحاد کی پائیدار بنیاد ہے۔ اس اسلامی اتحاد کی

جتنی ضرورت مسلمانوں کو ہے اُتنی ہی ضرورت انسانوں کو بھی ہے۔ سامراج جبرو تشدد سے پھولتا پھلتا ہے اور انسانیت کی کھیتی کو اجاڑنا اپنا فرضِ اول سمجھتا ہے۔ اس لیے سامراجی جبر و تشدد اتحادِ اسلامی کا سب سے بڑا دُشمن ہے۔ سچا اسلامی اتحاد مسلمان قوموں کے آزادانہ اور رضا کارانہ اتحادِ فکر و عمل سے عبارت ہے۔ اقبال اس اسلامی جمہوری اتحاد کے مفکر اور مغنی ہیں۔

....

حواشی

(۱) محمد اقبال، "The Reconstruction of Religious Thought in Islam"، لاہور، 1969ء، (ص ۱۲۶)۔

(۲) بی۔ اے۔ ڈار (ایڈیٹر) Letters and Writings of Iqabl لاہور، 1981ء، (صفحہ 55، 56، 57)

"The term Pan-Islamism has been used in two senses. Af far as I know, it was coined by a French journalist and in the sense in which he used that term, Pan-Islamism existed nowhere except in his own imagination. I think the French journalist meant to give shape to a danger which he fancied was existing in the world of Islam. The phrase was invented after the fashion of the expression "Yellow Peril," in order to justify European aggression in Islamic countries.

There is, however, a sense in which Jamaluddin Afghani used it. I do not know if he used the same expression, but he actually advised Afghanistan, Persia and Turkey to unite against the aggression of Europe. This was purely a defensive measure, and I personally think that Jamaluddin was perfectly right in his view.

But there is another sense in which the word should be used and it does contain the teaching of the Quran. In that sense it is not a political project but a social experiment. Islam does not recognise caste or race or colour. In fact Islam is the only outlook on life which has really solved the colour question, at least in the Muslim world, a question which modern European civilization with all its achievements in science and philosophy, has not been able to solve. Pan-Islamism, thus interpreted, was taught by the Prophet and will live for ever. In this sense Pan-Islamism is only Pan-Humanism. In this sense every Muslim is a Pan-Islamist and ought to be so. Indeed the word Pan ought to be dropped from the phrase Pan-Islamism, for Islamism is an expression which completely covers the meaning I have mentioned above."

Interview with "The Bombay Chronicle", (17th September-December 31, 1931).

اقبال کی شاعری میں تصورِ پاکستان کا عکس

خطبۂ الہ آباد نے برطانوی حکومت کے درباروں اور انڈین نیشنل کانگرس کے ایوانوں میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ لندن کی گول میز کانفرنس میں برطانیہ کے کانگرس نواز وزیراعظم کے دباؤ میں آ کر مسلمان مندوبین اپنی ساری سیاسی متاع لٹا بیٹھے تھے اور یوں وزیراعظم شاداں اور فرحاں متحدہ ہندوستان کے لیے آئینی خاکے کو آخری شکل دینے میں مصروف تھے کہ اتنے میں خطبۂ الہ آباد کی خبر لندن پہنچی۔ چنانچہ برطانوی وزیراعظم نے غضبناک ہو کر کہا کہ اقبال کی اس شرارت نے ہمارے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ غیظ و غضب کی اس کیفیت کا ذرا سا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:۔

"That was a bomb-shell for the British as well as the Hindus. Mr. F. W. Wilson, the London Correspondent of the Indian Daily Mail of Bombay said in his despatch dated December 31, 1930 that Ramsay MacDonald was highly displeased with the views expressed by Iqbal. This was followed by a despatch from London published in the Leader of Allahabad in its

issue, dated January 4, 1931. This stated that the British as well as Indian circles in the Round Table Conference expressed resentment against what it called an assault made by Iqbal on the idea of an all-India constitution being worked out there. Later the Times of India and the Pioneer wrote editorials against Iqbal's proposal. The Tribune of Lahore was of the view that Iqbal had torpedoed all chances for a communal settlement, first by sending a telegram to Muslim delegates protesting against their conditional acceptance of the principle of joint electorate and then by delivering his Presidential address at Allahabad."

یہ تو تھا کانگرس نواز حکومتِ برطانیہ کا رویہ۔ خود انڈین نیشنل کانگرس اور ہندو پریس نے خطبۂ الہ آباد میں پیش کی گئی تجاویز کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ تنگ نظری اور تعصب سے لے کر ہندو دشمنی تک کون سا الزام تھا جو اقبال کو نہ دیا گیا۔ ادھر مسلمان سیاسی زعما مہر بلب ہو گئے۔ ان لوگوں نے اقبال کی تجاویز کو زیرِ غور لانا ہی مناسب نہ سمجھا۔ اس کے برعکس اقبال کی تجاویز نے مسلمان عوام میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ عامۃ المسلمین مایوسی کو جھٹک کر سیاسی عزم و عمل کی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اقبال کی شاعری تھی۔ اقبال کی شاعری اسلامیانِ ہند کی رگوں

میں خون کی طرح گردش کر رہی تھی۔ خطبۂ الہ آباد سے تیئس برس پیشتر اقبال نے ۱۹۰۷ء میں اپنی مقبول عام غزل میں اعلان کیا تھا:۔

دیار مغرب کے رہنے والو! خُدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا

یہ گویا ہندی مسلمانوں کا نیا سیاسی منشور تھا جس کا سنگِ بنیاد اقبال نے ۱۹۰۷ء کی اس غزل میں رکھ دیا تھا۔ اگلے سال انھوں نے ''وطنیت'' کے سیاسی تصور کو رد کرتے وقت اسے مغربی تہذیب کے آذر کا تر شوایا ہوا نیا بت قرار دیا:۔

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خُداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے!

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مسلمان سیاستدانوں سے مایوس ہونے کے بعد گزشتہ ربع صدی سے اقبال مسلمان عوام سے ہمکلام تھے۔ مسلمانوں میں فرقہ بندی کے پیدا کردہ فکری انتشار کو فکری یگانگت میں بدلنے کے لیے اقبال نے ایک بڑا مؤثر وسیلۂ اظہار ڈھونڈھ لیا تھا۔ فکری وحدت اور نظریاتی صلابت کے حصول کے لیے انھوں نے آنحضورﷺ کی ذاتِ والا صفات کو اپنی شاعری میں لفظ اسلام کے متبادل کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ حکمران طبقہ انگریز کی غلامانہ وفاداری کا خوگر تھا انگریز ہی کے مشوروں پر چلتا تھا اس لیے وہ اُس سے ہمکلام ہونا بیکار سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی فکری تنہائی کا مداوا اور اپنے دِل کے اضطراب کا چارہ وہ آنحضورﷺ سے فریاد میں ڈھونڈنے لگے تھے۔ خیال ہی خیال میں کبھی تو وہ طرابلس کے شہیدوں کے لہو سے بھرا ہوا آبگینہ لے کر آنحضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے اور کبھی صورتِ حال کچھ یوں ہو جاتی کہ:-

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں
غضب ہیں یہ ''مرشدانِ خود بیں'' خدا تری قوم کو بچائے!
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں
سُنے گا اقبال کون ان کو، یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پُرانی باتیں سُنا رہے ہیں!

اس دور کی شاعری پر ایک نظر دوڑائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال تڑپ تڑپ کر ایک ہی دُعا مانگنے میں مصروف ہیں اور وہ یہ کہ اللہ اُن کی زبان میں تاثیر کا وہ جادو بھر دے کہ اُن کی ''پُرانی باتوں'' کا نیا پن مسلمان عوام پر منکشف ہو جائے، وہ حریمِ مغرب کی زیارت کے شائق سیاسی رہنماؤں کی رہزنی کا بھید پالیں اور اقبال کی آواز پہلے اُن کے دل میں اُترے اور پھر اُن کے لیے بانگِ درا بن جائے۔ نظم ''شکوہ'' کے اختتامی بند دیکھیے:-

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہد گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک
قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں

ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

بارگاہِ ایزدی میں اقبال کی یہ فریادیں سنی گئیں اور ان کی باتوں میں ایسی نادر ونایاب تاثیر پیدا ہوگئی کہ جب اہلِ لاہور کو یہ خبر ملی کہ اقبال نے "جوابِ شکوہ" لکھ لیا ہے تو انھوں نے اس نظم کی اشاعت کا انتظار نہ کیا بلکہ ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا جس میں اقبال سے "جوابِ شکوہ" پڑھنے کی درخواست کی گئی۔ دُنیا کی ادبی تاریخ میں اس واقعے کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی شاعر سے اُس کی تازہ نظم سننے کے لیے قارئین نے ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا ہو۔ اس جلسۂ عام میں اقبال نے اللہ میاں کی طرف سے مسلمانوں کو یہ سرزنش کی:-

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

....

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ ﷺ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمد ﷺ کا تمہیں پاس نہیں!

اس جواب طلبی کے بعد اللہ میاں مسلمانوں کو ذلت اور پستی کی زندگی سے نجات کا صراط مستقیم بتاتے ہیں:۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کر دے

....

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسی زمانے کی ایک اور نظم "مذہب" میں اقبال اسلامیانِ ہند کو اپنی جداگانہ قومیت کا احساس یوں دلاتے ہیں:۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اپنی فارسی مثنویوں ....اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی.........میں انھوں نے مسلمان قومیت کا عقدہ قرآنِ حکیم اور سیرتِ نبوی کی روشنی میں حل کیا اور

ہندی مسلمانوں کو جداگانہ مسلمان قومیت کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ مثنوی ''رموز بے خودی'' میں ''در معنیٰ این کہ چوں ملت محمدیہ موسس بر توحید و رسالت است پس نہایت مکانی ندارد'' کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں:۔

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں
قصہ گویاں حق زما پوشیدہ اند
معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قیدِ مقام آزاد شو
ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد
چوں فلک در شش جہت آباد شد
چوں صبا بارِ قبول از دوش گیر
گلشن اندر حلقۂ آغوش گیر
از فریبِ عصر نو ہشیار باش
رہ فتد اے راہرو ہشیار باش

تصورِ پاکستان کو باقاعدہ ایک سیاسی نظریہ کے طور پر پیش کرنے سے پہلے اقبال لگ بھگ ربع صدی تک اپنی اردو اور فارسی شاعری کے اعجاز سے اسلامیانِ ہند

کو خطبۂ الہ آباد کے معانی و مفاہیم سمجھانے میں مصروف رہے تھے۔ نتیجہ یہ کہ جو بات سیاسی رہنماؤں کی سمجھ میں دس سال بعد آئی اسلامیانِ ہند اُسے فی الفور سمجھ گئے اور انھوں نے اسے اپنا سیاسی نصب العین بنالیا۔ کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۲۱/ مارچ ۱۹۳۲ء) سے خطاب کرتے وقت انھوں نے بزرگ نسل کی شکست خوردہ ذہنیت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ یہ ناداں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اسلامیانِ ہند کی موجودہ مشکلات ناقابلِ عبور ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ان عارضی مشکلات کے سامنے سپر انداز ہو گئے ہیں۔ بزرگ نسل کو اپنے حال پر چھوڑ کر اقبال نے مسلمان نوجوانوں کو بطور خاص درسِ عمل دیا:-

"The lesson that past experience has brought to you must be taken to heart. Expect nothing from any side. Concentrate your whole ego on yourself alone, and ripen your clay into real manhood if you wish to see your aspirations realized. Our ideal is well defined. It is necessary in the light of this ideal to rouse the progressive forces of the community and to organise their hitherto dormant energies. The flame of life cannot be borrowed from others; it must be kindled in the temple of one's own soul. This requires earnest preparation and a relatively permanent programm.......Let then the fire of youth mingle with the fire of

faith in order to enhance the glow of life and to create a new world of actions for our future generations. — Your immediate duty is to prepare the whole community for the kind of self-sacrifice without which no self-respecting people can live an honourable life. The most critical moment in the history of the Indian Muslims has arrived. Do your duty or cease to exist."(2)

یہ بڑا دلچسپ اتفاق ہے کہ جس زمانے میں اقبال ان سیاسی خطبات کی تیاری میں مصروف تھے اُسی زمانے میں وہ اپنی عہد آفریں شعری تخلیق ''جاوید نامہ'' کی صورت گری میں بھی مصروف تھے۔ ''جاوید نامہ'' کے فلک عطارد پر جب سید جمال الدین افغانی ملتِ اسلامیہ کے مسائل و مصائب سے آگہی کی خاطر لب کشائی کرتے ہیں تو اقبال انھیں بتاتے ہیں کہ اس ملتِ گیتی شکن کے ضمیر میں دین و وطن اور اشتراک و ملوکیت کی کشمکش برپا ہے۔ اس پر افغانی دین و وطن اور اشتراک و ملوکیت کی اس آویزش پر اپنا محاکمہ پیش کرتے ہیں۔ اس پر اقبال یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ بجا اور درست کہ اشتراکیت اور ملوکیت ہر دو کا مقدر تباہی ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ عالم قرآن ہے کہاں؟ اس پر افغانی بتاتے ہیں کہ قرآنی دُنیا کا مکمل ظہور ابھی تک نہیں ہوا اور یہ ہنوز قرآن کریم کے اندر ہی پوشیدہ ہے: -

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز
عالمے در انتظارِ قُم ہنوز
عالمے بے امتیازِ خون و رنگ
شامِ اُو روشن تراز صبحِ فرنگ

عالمے پاک از سلاطین و عبید
چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر
تخم او افگند در جانِ عمرؓ!
لایزال و وارداتش نو بنو
برگ و بارِ محکماتش نو بنو
باطنِ او از تغیر بے غمے
ظاہرِ او انقلاب ہر دمے
اندرون تست آں عالم نگر
می دہم از محکماتِ او خبر!

انقلابِ مسلسل سے عبارت اس عالمِ قرآنی کے محکمات کا بیان گویا اقبال کے تصورِ پاکستان کا مثالی خاکہ ہے۔ سید جمال الدین افغانی اس مثالی اسلامی ریاست کے درج ذیل چار بنیادی محکمات پر روشنی ڈالتے ہیں:-

۱۔ خلافتِ آدم

قرآنی معاشرہ آدمیت کے انتہائی احترام سے عبارت ہے۔ ہر چند یہ معاشرہ اپنے مخصوص زمان و مکان رکھتا ہے تاہم اس کی اساس آفاقی اور ابدی اصولوں پر قائم ہے۔ ابنِ آدم عشق کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔ چونکہ سرِ عشق لازمانی اور لامکانی ہے اس لیے اس معاشرے میں ہنگامی، وقتی اور مقامی سرگرمیوں کو بھی دوامی، ابدی اور آفاقی اصولوں کے پیشِ نظر سرانجام دیا جاتا ہے:-

کوکبِ بے شرق و غرب و بے غروب
در مدارش نے شمال و نے جنوب
او امام و او صلوات و او حرم
او مداد و او کتاب و او قلم!

از وجودش اعتبارِ ممکنات
اعتدالِ او عیارِ ممکنات
من چہ گویم از یم بے ساحلش
غرق اعصار و دہور اندر دلش!

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

ایک اسلامی معاشرے میں آدمی کا مقام فرقہ و مسلک اور مذہب و ملت کی حد بندیوں سے اوپر، بہت ہی اوپر، آسمان سے بھی اوپر ہے۔ یہاں آدمیت کا احترام سب سے بڑی نیکی ہے۔ آدمی کی عظمت اُس کی تخلیقی استعدادِ کار سے عبارت ہے:-

ذوقِ تخلیق آتشے اندر بدن
از فروغ او فروغ انجمن!
ہر زماں بر نقشِ خود بندد نظر
تا نگیرد لوح او نقشِ دگر
مصطفیٰ ﷺ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقشِ ما را در دلِ او ریختند
ملتے از خلوتش انگیختند

مسلسل تخلیق میں عبادت کی حد تک منہمک یہ معاشرہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ یہاں علم اور عشق ایک دوسرے کے رقیب نہیں بلکہ رفیق ہیں۔ یہ ایک ایسی دُنیا ہے جہاں تحقیق اور تخلیق، سائنس اور شاعری کے مابین تخلیقی لین دین کا رشتہ قوی سے قوی تر ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں آدمی پر آثارِ حیات مسلسل منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ وہ جلوت ہو یا خلوت تخلیق کا سرکش شعلہ ہر جگہ فروزاں رہتا ہے:-

علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات
ہر دوی گیرد نصیب از واردات!
علم از تحقیق لذت می برد
عشق از تخلیق لذت می برد
صاحبِ تحقیق را جلوت عزیز
صاحبِ تخلیق را خلوت عزیز

۲۔ حکومتِ الٰہی

اقبال کے تصور کے پاکستان میں حکومت و سیاست کے رہنما اصول کیا ہوں گے؟ اس کا اندازہ ''جاوید نامہ'' کے اس باب سے کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلا اصول مادی اور روحانی آزادی کا اصول ہے۔ چنانچہ اس مملکت میں غلامی کا نام و نشان تک مٹ کر رہ جائے گا۔ یہاں کے لوگ نہ خود کسی کی غلامی گوارا کریں گے اور نہ کسی کو اپنا غلام بنانے کے گناہ کے مرتکب ہوں گے۔ یہاں اُن لوگوں کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا جو وسیع تر انسانی بہبود کا لائحۂ عمل ترک کر کے عوامی مال و متاع کو اپنی ذاتی بہبود کا ذریعہ بنالیں گے:۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را، نہ او کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خدا داد است و بس
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سُودِ خود بیند نہ بیند سُودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سُود و بہبود ہمہ

اگلے بند میں علامہ اس طرزِ سیاست و معاشرت کا مقابلہ شہنشاہیت اور

سامراجیت کے طرز ہائے سیاست و معاشرت سے کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مطلق العنان بادشاہوں کے آئین و دستور کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ جاگیر دار اور وڈیرے سردار اور خوانین تو خوب موٹے تازے رہیں مگر دہقان اور مزدور جن کی کمائی ہوئی دولت کو چھین کر یہ لٹیرے اللہ کے دیے ہوئے وسائلِ رزق پر اپنی اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں زار و زبوں رہیں:-

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک!
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک!

یہ بتانے کے بعد کہ پاکستان میں مطلق العنان شہنشاہیت اور کسی بھی نوع کی آمریت کی قطعاً کوئی گنجائش نہ ہو گی وہ ان نظاموں کے ساتھ ساتھ فرنگی سامراجیت کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ تیسرے بند میں پہلے تو مغربی سامراج کے مقاصد و محرکات سامنے لائے گئے ہیں اور پھر اُسے حتمی طور پر رد کر دیا گیا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ فرنگی جمہوریت کا دستور مردہ کو مردہ تر کر دیتا ہے۔ یہ سوداگروں کے استحصالی نظام کا دوسرا نام ہے۔ فرنگی جمہوریت انسان کو جنسِ بازار سمجھتی ہے اور انسانوں کی تجارت کو سیاست کا بنیادی مقصد قرار دیتی ہے:-

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ!
فاش باید گفت سرِ دلبراں
ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں!
دیدہ ہا بے نم ز حبِ سیم و زر
مادراں را بارِ دوش آمد پسر
گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ
من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!
اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو!

۳۔ ارض ملک خُدا است

اس باب کو اگر "بالِ جبریل" کی نظم "الارض للہ" کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو ذرائع پیداوار کے بارے میں قرآنی تعلیمات اور زیادہ مؤثر انداز میں سامنے آ جاتی ہیں:۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اقبال نے اپنی شاعری، اپنی نثری تحریروں اور قانون ساز اسمبلی اپنی سیاسی تقریروں میں اس حقیقت کو اپنے تمام ابعاد کے ساتھ روشن کیا ہے کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ یہ ایک بنیادی ذریعۂ پیداوار ہے جس پر صرف کاشتکار کا حق ہے۔ ہر شخص کو اس ذریعۂ پیداوار سے کام لینے کا اُتنا ہی حق ہے جتنا وہ کاشت کر سکتا ہے۔ قانون ساز اسمبلی میں اقبال نے سب سے پہلے زرعی آمدن پر ٹیکس عاید کرنے کی آواز اُٹھائی تھی۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستان میں مصورِ پاکستان کی یہ تجویز آج تک اپنے عملی نفاذ کو ترس رہی ہے۔ زیرِ بحث باب میں بھی وہ برملا کہتے ہیں:۔

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
تو عقابی طائفِ افلاک شو
بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

باطن الارض للہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اقبال کے نزدیک جو شخص قرآن حکیم کی آیہ کریمہ الارض للہ کے باطنی مفہوم کو خارجی زندگی میں روبہ عمل نہیں لاتا وہ کافر ہے۔ اقبال نے ۵ مارچ ۱۹۲۷ء کو پنجاب قانون ساز کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس تصور کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ پنجاب کی ساری اراضی کا مالک تاج برطانیہ ہے۔ انھوں نے اس تصور کو دورِ وحشت و بربریت کی یادگار قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"Neither in ancient India nor even in the days of the Mughals the soverign ever claimed universal ownership. This is the historical aspect of the matter....The fact remains that in this country the soverign never claimed any such rights. We are told that the Mughals claimed such rights; but the people of the Punjab owned and possessed the land of this country long before the race of Babar entered into history__the unmistakable lesson of which is that Crowns come and go; the people alone are immortal."[3]

اقبال نے مختلف اور متنوع انداز میں جاگیرداری نظام کی تردید کر رکھی ہے۔ ''بانگ درا'' میں شامل ظریفانہ کلام میں بھی اس نظام کے حامیوں کی منطق کو طنز اور تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ایک مختصر سی نظم میں مزارع و مالک کے درمیان حقِ ملکیت پر ہونے والی تکرار اور اس تکرار پر خود زمین کا ردِعمل ملاحظہ ہو:-

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
دونوں یہ کہہ رہے تھے، مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ، کرے جو زراعت اُسی کا کھیت
کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تُو
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے، وہ دھرتی کا مال ہے

اقبال کے تصورِ پاکستان میں زرعی اراضی پر حکومت کا کوئی حق نہیں۔ تمام اراضی پاکستان کے عوام کی ملکیت ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں کو یہ اجازت دے رکھی ہے کہ اُن میں سے جو جتنی زمین کاشت کرتا ہے اُس کی پیداوار پر فقط اُسی کا حق ہے۔ تمام ذرائع پیداوار کی طرح زرعی اراضی کا مطلق مالک خود خُداوند کریم ہے، جس نے اراضی پر محنت کرنے والوں کو یہ اراضی بطور امانت دے رکھی ہے تاکہ وہ اس کے ثمرات سے فیضیاب ہوسکیں۔

۴۔ حکمت خیر کثیر است

عالم قرآنی میں علم وحکمت کو خیرِ کثیر قرار دیا گیا ہے اور علم وحکمت کی تلاش و جستجو کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ علم وحکمت جہاں سے بھی ملے، جس ذریعے سے بھی حاصل ہو آدمی اُسے اپنا گم شدہ مال سمجھے۔ علم سراسر نور ہے۔ یہ نور ابلیس کی صحبت میں نار بن جاتا ہے۔ اس لیے طالب علم کو چاہیے کہ وہ علم اور عشق کو باہم دگر آمیز کرتا رہے تاکہ علم انسانیت کے لیے آگ نہ بنے اور نورٌ علیٰ نور رہے۔ اس عمل کی مشکلات کی جانب اشارہ کرتے وقت اقبال کہتے ہیں:۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی
از جلالِ بے جمالے الاماں
از فراق بے و صالے الاماں!
علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں!
بے محبت علم و حکمت مردۂ
عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ
کور را بینندہ از دیدار کُن
بولہب را حیدرِ کرار کُن!

محکماتِ عالمِ قرآنی یعنی تصورِ پاکستان کا یہ بیان ''بولہب را حیدرِ کرار کن!'' کی تلقین پر تمام ہوتا ہے تو اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ یہ اسلامی دنیا روئے زمین پر کہیں بھی موجود نہیں ہے اور عہدِ حاضر کی دُنیائے اسلام زوال کی گرفت اور فرسودگی کی لپیٹ میں ہے۔ آج کے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اس عالمِ قرآنی کو حجابات سے رہائی دلا کر عملاً دُنیائے انسانیت کے سامنے پیش کرے:-

محکماتش و انمودی از کتاب
ہست آں عالم ہنوز اندر حجاب!
پردہ را از چہرہ نکشاید چرا
از ضمیرِ ما بروں ناید چرا
پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ ایست
ملت اندر خاکِ او آسودہ ایست
رفت سوزِ سینۂ تاتار و کُرد
یا مسلماں مُرد یا قرآں بُمرد!

پاکستان کا تصور فرسودہ عصری نظام ہائے حیات کی خاکستر سے ایک قرآنی دُنیا پیدا کرنے کا تصور ہے۔ اقبال نے بلاشبہ ایک اسلامی، جمہوری، انقلابی پاکستان کا تصور دیا تھا۔ ایک ایسی اسلامی ریاست کا تصور جہاں آدم کو روئے زمین پر حقیقی معنوں میں خدا کے نائب کا مقام حاصل ہو سکے گا۔ ۱۹۰۷ء سے لے کر اپنی آخری نظم تک وہ ہمیں یہی تلقین کرتے رہے ہیں کہ:-

بمصطفٰیؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ او نہ رسیدی، تمام بولہبیست!

اپنی بصیرت سے انھوں نے بہت جلد یہ جان لیا تھا کہ سوائے محمد علی جناح کے مسلمان سیاستدانوں میں کوئی بھی شخص اسلامیانِ ہند کی تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اپنی زندگی کے آخری آٹھ برسوں کے دوران صرف نوجوان ہی اُن کی اُمیدوں کا مرکز تھے۔ اُس زمانے میں علامہ اقبال بزرگ نسل کی ابن الوقتی اور موقع پرستی پر نالاں ہو کر بارگاہِ الٰہی میں بدست بہ دعا تھے:-

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

اقبال پر ان دنوں گدازِ قلب کی ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ وہ اپنے اللہ سے بچوں کی طرح مچل مچل کر ایک ہی ضد کرتے چلے آ رہے تھے:-

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدہ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالہ نیم شب کا نیاز
میری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں میری، آرزوئیں مری

امیدیں میری، جستجو میں مری
میری فطرت آئینہ روزگار
غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل، میری رزم گاہ حیات
گمانوں کے لشکر، یقین کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

لاہور کے جو نوجوان اقبال کے اس سرمایہ حیات پر ٹوٹ پڑے ان میں حمید نظامی اور عبدالسلام خورشید سر فہرست تھے۔ ان نوجوانوں نے علامہ اقبال ہی کے مشورے پر کانگرس نواز طلبہ تنظیم کے مقابلے میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی۔ حمید نظامی اور عبدالسلام خورشید بالترتیب اس کے پہلے صدر اور سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اقبال ہی کی رہنمائی میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے آئین میں پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر پر مشتمل ایک جداگانہ مسلمان مملکت کے قیام کا مطالبہ شامل کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتے میں اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں نوجوانوں کے ایک عظیم اجتماع میں قوموں کے حق خود اختیاری کے اصولوں پر اس جداگانہ مملکت کے لیے عملی جدوجہد کے آغاز کا اعلان کیا گیا۔ (۴) گویا قرارداد پاکستان سے سوا دو سال پہلے ہی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے خرد کو غلامی سے آزاد کر کے قرارداد پاکستان کی راہ ہموار کر دی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبال کو چھوڑ کر باقی تمام مسلم لیگی قیادت متحدہ انڈین فیڈریشن کی آئینی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی۔ ایسے میں اس اجتماع میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے جداگانہ مسلمان مملکت کے قیام کے مطالبہ کی پرجوش پذیرائی پر علامہ اقبال بے حد خوش ہوئے (۵) یوں جیسے بارگاہ ایزدی میں ان

کی یہ دعا مستجاب ہوگئی ہو۔

جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

نوجوانوں نے بوڑھوں کی قیادت کا حق بڑی بے جگری کے ساتھ ادا کیا۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں پنجاب کے اقتدار کی گدی پر سر سکندر حیات اور سر خضر حیات براجمان تھے جو برطانوی سامراج کے چشم و چراغ بھی تھے اور دست و بازو بھی۔ یہ لوگ اسمبلی کے اجلاس کے دوران یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ ''میں پاکستان کا حامی نہیں ہوں'' ...... اقبال اپنے بستر مرگ سے قائداعظم کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کے ذریعے اپنی آخری سانس تک مسلسل ہم کلام رہے۔ جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی اُس وقت اقبال اسلامیان ہند کو قائداعظم کے سپرد کر کے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ چنانچہ مقتدر ٹوڈی سیاستدانوں کا راستہ روکنے کا بار امانت نوجوانوں ہی کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ نوجوانوں نے اس بار امانت کا حق ادا کر دیا اور یوں پاکستان قائم ہو گیا۔

تحریک پاکستان کے بیشتر مؤرخین اقبال کی شاعری سے ناآشنا ہیں۔ یہ لوگ تحریکِ پاکستان میں اقبال کی فکری قیادت کے احوال و مقامات جاننے کے لیے اقبال کی شاعری سے اعتنا کرنا ضروری بھی نہیں سمجھتے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی تاریخی تحقیق ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتی ہے اور ۱۹۳۲ء پر ختم ہو جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مؤرخین پورے اقبال کو پڑھیں۔ اُن کی شاعری، اُن کے فلسفہ اور اُن کے سیاسی فکر و عمل کی از اول تا آخر تفہیم، تحریکِ پاکستان کے مؤرخین کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کیے بغیر نہ تو تصورِ پاکستان کی پوری معنویت کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی تحریکِ پاکستان کی فکری اساس سے مکمل شناسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے مؤرخین، شعر و ادب اور فلسفہ و حکمت کی وادی میں کب قدم رکھتے ہیں؟

....

حواشی

۱۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، "History of the Idea of Pakistan"۔ اسلام آباد، ۱۹۷۶ء، (ص۔ ۷۷)

۲۔ سید عبدالواحد، "Thoughts and Reflections of Iqbal"۔ لاہور، ۱۹۶۴ء، (ص۔ ۲۱۳)

(۳) سید عبدالواحد (مرتب) "Thoughts and Reflections of Iqbal" (ص۔ ۳۱۲)

۳ اور ۵۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، "History of the Idea of Pakistan" متعلقہ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

1."Some of us met Dr. Mohammad Iqbal a number of times and discussed with him the political and organizational matters. While framing the constitution, we were on the horns of a dilemma whether to toe the line of the Muslim League or to chalk out an independent course. When consulted on the point, Iqbal came out with the proposal that we set as our goal the establishment of a Muslim National State base on the Muslims right of selfdetermination and comprising the Punjab, N.W.F.P., Sind and Baluchistan and Kashmir. We readily agreed-rather welcomed it, and within a couple of days called a meeting of the executive, secured its approval and incorporated it in the constituion of the Punjab Muslim Students Federation." (P.94)

2. The Quaid-i-Azam had read our constitution. He knew our goal, which was fundamentally different from that of the League. But he had faith in us that vis-a-vis Congress, we were ardent votaries of the Muslim Leage; therefore, he continued to give us his support." (P.96).

اقبال اور سلطانیٔ جمہور کا اسلامی تصور

کثرتِ تعبیر نے اقبال کے جن خوابوں کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے اُن میں سے ایک خواب دین اور سیاست کی یکجائی کا خواب بھی ہے۔ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔'' کے سے مصرعوں اور اشعار کو اپنے سیاق و سباق سے کاٹ کر بعض طبقے یوں پیش کرتے ہیں جیسے اقبال تھیا کریسی کی وکالت کر رہے ہوں۔ اقبال نے اپنی نثری تحریروں میں اس خیال کا متعدد مرتبہ مدلل اور مؤثر پیرایۂ بیان میں اظہار کر رکھا ہے کہ اسلام میں تھیا کریسی یعنی علماء کی حکمرانی کے خدائی حق کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود دین اور سیاست کی جدائی کو مسلسل اور متواتر غلط مفہوم میں بیان کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں اقبال سے وہ تصورات منسوب کیے جاتے ہیں جن کے وہ دشمن ہیں۔

اقبال کے ہاں دین اور سیاست کی یکجائی کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی نظریہ اور عمل چند روحانی اصولوں اور قدروں کے تابع ہوں۔ جو سیاست اخلاقی احساسات سے عاری ہو کر سراسر مادی مفادات سے عبارت ہو کر رہ جائے وہ لامحالہ چنگیزی بن جاتی ہے۔ ایسی سیاست کو اقبال رد کرتے ہیں۔ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ:-

"Politics have their roots in the spiritual life of man. It is my belief that Islam is not a matter of private opinion. It is a society. It is

because present-day political ideals, as they appear to be shaping themselves in India, may affect its original structure andcharacter that I find myself interested in politics."(۱)

اقبال کی نظر میں اسلامی سیاسی نظام کی پہچان یہ ہے کہ اس کی جڑیں اسلام کے اخلاقی اور روحانی تصورات میں پیوست ہوں۔ جو لوگ اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ سیاسی نظام پر فقط برگزیدہ علمائے دین کا تسلط ہی اسے اسلامی بناتا ہے وہ اقبال سے غلط تصورات منسوب کرتے ہیں۔ اقبال نے اسلام کے اخلاقی اور سیاسی نصب العین کے موضوع پر اپنے انگریزی مقالہ میں بڑے قطعی اور دوٹوک انداز میں لکھا ہے کہ اسلام معاشرے میں مکمل اور غیر مشروط مساوات کا قائل ہے:۔

"There is no aristocracy in Islam. "The noblest among you," says the Prophet, "are those who fear God most." There is no privileged class, no priesthood, no caste system. Now, this principle of the equality of all believers made early Musalmans the greatest political power in the world. Islam worked as a levelling force; it gave the individual a sense of his inward power; it elevated those who were socially low. The elevation of the down-trodden was the chief secret of the Muslim political power in India."(۲)

اقبال کے نزدیک اسلام میں نہ تو اشرافیہ کا کوئی تصور ملتا ہے اور نہ ہی پاپائیت کی کوئی شکل موجود ہے۔ نتیجہ یہ کہ اسلام نہ تو خاندانی بادشاہت کو جائز قرار دیتا ہے اور نہ ہی علمائے حق کو حکمرانی کا کوئی خدائی اختیار دیتا ہے۔ اس بات کو جدید سیاسی اصطلاحات میں یوں کہیں گے کہ اسلام میں نہ تو تھیا کریسی ہے اور نہ ہی امپیریلزم۔ اپنے فلسفیانہ خطبات میں ختم نبوت کے تصور کی ثقافتی معنویت پر روشنی ڈالتے وقت اقبال نے کہا ہے:۔

"The Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam is the birth of inductive intellect. The abolition of priesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Qur'an, and the emphasis that it lays on Nature and History as sources of human knowledge, are all different aspects of the same idea of finality." (۳)

اقبال کا کہنا یہ ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل کرنے کے ساتھ ہی

نبوت کو ختم کر دیا اُسی وقت خاندانی بادشاہت بھی ختم ہو کر رہ گئی اور پاپائیت بھی۔ اسلام کوئی چرچ نہ رہا بلکہ سول سوسائٹی کی شکل اختیار کر گیا اور ہر وہ اتھارٹی ختم ہو کر رہ گئی جس کا سرچشمہ مافوق الفطرت قرار دیا جاتا تھا۔ خاندانی بادشاہت اور پروہت راج کے تصورات چونکہ ظہورِ اسلام سے پہلے کے خُدائی حقِ حکمرانی سے عبارت تھے اس لیے انہیں بھی رد کر دیا گیا۔ اب حکمرانی کا حق اللہ نے اپنے تمام بندوں کو تفویض کر دیا ہے جو اللہ کی حدود میں رہ کر اسے ایک مقدس امانت کے طور پر استعمال کرنے کے پابند ہیں۔ خلقِ خُدا اپنا یہ حق اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرتے ہیں۔ طریقِ انتخاب اور سیاسی ادارے لامحالہ ہر زمانے کے مطالبات اور ہر معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات کے پیشِ نظر بدلتے رہیں گے مگر انتخاب کا ابدی اصول قائم و دائم رہے گا۔ اپنے مضمون ''مسلم پولیٹیکل تھاٹ'' (مطبوعہ ۱۹۱۰ء) میں اقبال اسلام میں سیاسی فکر کے نمایاں دھاروں کا تعارف و تجزیہ پیش کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ:-

"It is clear that the fundamental principle laid down in the Quran is the principle of election; the details or rather the translation of this principle into a workable scheme of Government is left to be determined by other considerations. Unfortunately, however, the idea of election did not develop on strictly democratic lines, and the Muslim conquerors consequently failed to do anything for the political improvement of Asia."(۴)

اسی زمانے کے ایک اور مضمون "Divine Right to Rule"(۵)

میں اقبال آنحضور ﷺ کی ذات والا صفات کی مثال پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام میں کسی بھی شخص یا کسی بھی خاندان کو حکمرانی کا حق حاصل نہیں ہے ۔ چنانچہ ظہور اسلام کے ساتھ ہی خاندانی بادشاہت اور پاپائیت کے قدیم اور فرسودہ ادارے منہدم ہو کر رہ گئے ۔ اقبال کے نزدیک اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے اور اسلام دُنیائے انسانیت کے لیے یہ نوید لے کر طلوع ہوا تھا کہ :-

سلطانئ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو!

چنانچہ دُنیا نے آنحضور ﷺ کی قیادت میں ''لا قیصر و لا کسریٰ'' کی انقلابی صدا کو حقیقت بنتے دیکھا مگر سانحہ یہ ہوا کہ پہلی صدی ہجری ہی میں اسلامی خلافت کا نظام دورِ جاہلیت کے نظام ملوکیت میں بدل کر رکھ دیا گیا :-

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

ملوکیت کی طویل صدیوں کے دوران اسلام کا سیاسی نظام خاندانی شہنشاہیت کے جاہلی نظام کا یرغمال ہو کر رہ گیا اور یوں سلطانئ جمہور (Republicanism) کی اسلامی روح بروئے کار نہ آ سکی ۔ اقبال عمر بھر اسلام کی اس حقیقی روح کو ازسرِنو دریافت کرنے اور مسلمان معاشروں میں پھر سے سرگرمِ کار بنانے میں مصروف رہے ۔

اسلام میں اجتہاد کی اہمیت پر روشنی ڈالتے وقت انھوں نے اجماع کو اہم ترین قانونی تصور قرار دیا ہے ۔ اقبال اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اجماع کے تصور کی عملی اہمیت کو ہمیشہ نظر انداز کیے رکھا :-

"It is, however , strange that this important notion, while invoking great academic discussions in early Islam,

remained practically a mere idea, and rarely assumed the form of a permanent institution in any Muhammadan country. Possibly its transformation into a permanent legislative institution was contrary to the political interests of the kind of absolute monarchy that grew up in Islam immediately after the fourth Caliph. It was, I think, favourable to the interest of the Umayyad and the Abbaside Caliphs to leave the power of Ijtihad to individual Mujtahids rather than encourage the formation of a permanent assembly which might become too powerful for them."(۲)

گویا یہ ملوکیت ہی کا شاخسانہ ہے کہ مسلمانوں میں اجتہاد کا دروازہ بہت جلد بند ہو کر رہ گیا اور یوں قانون سازی کا عمل انجماد اور فرسودگی کی نذر ہو کر رہ گیا۔ بادشاہوں نے اپنی ملوکانہ اغراض کے پیش نظر اجماع کے تصور کو کبھی ادارے کی شکل نہ اختیار کرنے دی۔ اقبال نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اجماع کے تصور کو قانون ساز اسمبلی کے منتخب ادارہ میں ڈھالنے کی اہمیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:-

" The transfer of the power of Ijtihad from individual representatives of schools to a Muslim legislative assembly which, in

view of the growth of opposing sects, is the only possible form Ijma can take in modern times, will secure contributions to legal discussion from laymen who happen to possess a keen insight into affairs. In this way alone can we stir into activity the dormant spirit of life in our legal system, and give it an evolutionary outlook. In India, however, difficulties are likely to arise for it is doubtful whether a non-Muslim legislative assembly can exercise the power of Ijtihad".[۷]

یہاں دو باتیں انتہائی معنی خیز ہیں۔ اول یہ کہ اقبال قانون سازی کے عمل میں عام مسلمانوں کی عقل و دانش کو خاطر میں لانا ضروری اور مستحسن قرار دیتے ہیں۔ دوم یہ کہ انھیں ہندی مسلمانوں کی مخصوص اقلیتی صورتِ حال پر گہری تشویش ہے۔ سن انیس سو اٹھائیس کے اس خطبہ میں وہ اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ جہاں قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی اقلیت ہو وہاں اسلام میں قانون سازی کا عمل کیسے جاری رہ سکتا ہے؟ نہیں رہ سکتا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ ایک جداگانہ آئین ساز اسمبلی قائم کی جائے مگر اس اسمبلی کو وجود میں لانے کے لیے ایک جداگانہ مسلمان مملکت ضروری ہے۔ کیا اس مسلمان مملکت کا قیام دائرۂ امکان میں ہے؟ اقبال اس سوال پر مسلسل غور و فکر میں مصروف رہے۔ چنانچہ فقط دو سال کے بعد انھوں نے برصغیر میں جداگانہ مسلمان مملکت کا تصور پیش کر دیا۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اقبال کے تصور کا پاکستان لازماً ایک عوامی جمہوری پاکستان ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس زمانے میں اقبال ہندی مسلمانوں کی بقا اور ترقی کی تدبیریں سوچنے میں مصروف تھے اُس زمانے میں اقبال کے ہم عصر قدامت پسند علماء ہی نہیں بلکہ علامہ مشرقی جیسے جدید تعلیم یافتہ سائنسدان بھی پورے برٹش انڈیا پر غلبۂ اسلام کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے برعکس علامہ اقبال سلطانئ جمہور کے اسلامی تصورات پر مبنی جدید قومی ریاست کی صورت گری میں منہمک تھے۔ جمہوری انداز میں سوچتے ہوئے وہ مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل مسلمان مملکتوں اور ہندو اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ہندو ریاستوں کے قیام کا جمہوری تصور اُجاگر کرنے میں مصروف تھے۔ وہ جہاں اپنی مسلمان قوم کو جمہوری حق دلوانے کی جدوجہد میں مصروف تھے وہاں وہ ہندو قوم اور اچھوت قوم کے حقِ خود اختیاری کو بھی کھلے دل سے تسلیم کر رہے تھے۔ وہ خود بھی آزاد رہنا چاہتے تھے اور دوسروں کی آزادی اور خودمختاری کا حق بھی تسلیم کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک پورے ہندوستان پر اسلام کا بزورِ شمشیر غلبہ ایک غیر اسلامی اور فاشسٹ تصور ہے۔ بندۂ مومن وہ ہے جو نہ تو خود کسی کی غلامی قبول کرتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کو اپنا غلام بنانا گوارا کرتا ہے۔ یہ ہے سلطانئ جمہور کا وہ اسلامی تصور جسے اقبال نے عہدِ حاضر کے علوم کی روشنی میں قرآنِ حکیم میں ڈوب کر دریافت کیا اور عملی زندگی میں جس کی جلوہ گری کی تمنا میں عوامی جمہوری پاکستان کا تصور پیش کیا۔

یہاں یہ سوال اُٹھانا برمحل ہے کہ جب سلطانئ جمہور کا تصور پاکستان کے تصور کا جزو لاینفک ہے تو پھر پاکستان میں آمریت کے وکیل اپنے استدلال کو اقبال کے اشعار سے مزین کر کے اقبال کو جمہوریت کا دُشمن اور آمریت کا رفیق ثابت کرنے میں کیوں مصروف رہتے ہیں؟ اس کیوں کا جواب تو یہ ہے کہ اقبال کو مفکرِ پاکستان کا مرتبہ حاصل ہے اس لیے یہ لوگ اپنی آمریت پسندی اور آمرنوازی کی سند اقبال سے لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے ہمیشہ جمہوریت کے مغربی چلن کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس تنقید کے پیچھے جمہوریت کی اصلاح کا جذبہ

کارفرما ہے۔ وہ سچی جمہوریت کورد نہیں کرتے بلکہ فقط جمہوری تماشا کو اپنی طنز کا نشانہ بناتے ہیں:-

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اپنی مشہور نظم ''خضرِ راہ'' میں وہ جناب خضر کی زبانی مغربی جمہوریت کی استبدادی روح کو یوں بے نقاب کرتے ہیں:-

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس، الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو

درج بالا اشعار ایک پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جنابِ خضر کو مغربی جمہوریت پر سب سے بڑا اعتراض ہی یہ ہے کہ اس نظام کی روح شاہی ہے جمہوری نہیں۔ اس نظام کا ظاہر بیشک جمہوریت کی نیلم پری کا تاثر دیتا ہے مگر اس کے باطن میں وہی پرانا دیوِ استبداد رقصاں ہے۔ مغرب کا یہ جمہوری نظام سرمایہ داروں کی جنگِ زرگری سے عبارت ہے۔ درحقیقت یہ ایک رنگین قفس ہے مگر ظاہر بیں آنکھ کو گلستاں نظر آتا ہے۔ جب مسافر اس گلستاں تک رسائی حاصل کرتا ہے تب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ایک قفس ہے۔

جنابِ خضر کی یہ تنقید جمہوریت کے تصور کی تردید ہرگز نہیں بلکہ مغربی جمہوریت کے استبدادی کردار کی نفی اور حقیقی جمہوریت کا اثبات ہے۔ اقبال کی طویل نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں جب ابلیس کا ایک مشیر جمہوریت کو ایک ''تازہ فتنہ'' قرار دیتا ہے تو ابلیس اسے اطمینان کا درس دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ مغربی جمہوریت سے ابلیس کے نظام کو کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ نظام تو ملوکیت ہی کا ایک پردہ ہے:-

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے

یہ وجودِ میر و سُلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو

ہے وہ سُلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تُو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟

چہرہ روشن، اندرُوں چنگیز سے تاریک تر!

مغرب کا یہ جمہوری نظام برٹش انڈیا میں نافذ کرتے وقت انگریز حکمرانوں نے بصد احتیاط اس کی باطنی روح (قیصریت) کی حفاظت کا اہتمام کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نظام کو چلانے کی خاطر شاطر حکمرانوں نے جو مُہرے تیار کیے وہ مراعات یافتہ طبقات کے افراد تھے۔ چنانچہ ابلیس کو اس نظام سے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ ایک چھوٹی سی نظم ''سیاستِ افرنگ'' میں اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ:-

تری حریف ہے یارب! سیاستِ افرنگ

مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تُو نے

بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

اقبال اس بظاہر جمہوریت اور بباطن قیصریت کو اپنی تند و تیز تنقید کا نشانہ

بناتے وقت دراصل اس کی اصلاح کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ اس برائے نام جمہوریت کو روحانی جمہوریت کے تصور کی جانب نشو و نما پاتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس جمہوری نظام پر اقبال کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ نظام خدا کی بستی کو دُکان سمجھتا ہے اور خدا کے بندوں کو جنس بازار قرار دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک آدمی کو ''چیز'' سمجھ کر استعمال کرنا احترام آدمیت کی نفی ہے۔ آدمی چیز نہیں بلکہ ایک دانا و بینا ہستی ہے جس کو تہذیب و ثقافت کے زریں اصولوں کے مطابق اپنی ساخت پرداخت کا موقع فراہم کرنا کسی بھی اجتماعی نظام کی اولیں ذمہ داری ہونی چاہیے۔ ۱۹۱۰ء میں لکھے گئے ایک مختصر سے شذرہ میں اقبال یورپ کی جمہوریت اور مسلمان جمہوریت کا موازنہ یوں کرتے ہیں:۔

"The democracy of Europe, overshadowed by socialistic agitation and anarchical fear, originated mainly in the economic regeneration of european societies.The democracy of Islam did not grow out of the extension of economic opportunity, it is spiritual principle based on the assumption that every human being is a centre of latent power, the possibilities of which can be developed by cultivating a certain type of character. Out of the plebeian material. Islam has formed men of the noblest type of life and power."(۸)

اسلام کی ابتدائی پاکیزگی اور سادگی کے زمانے میں اسلام میں جو انقلابی روح کارفرما تھی اُسے رفتہ رفتہ ملوکیت نے فنا کر کے رکھ دیا۔ بیسویں صدی میں عقلی علوم میں حیرت انگیز ترقی اور ''اسلامی ایشیاء کے قرب و جوار میں رونما ہونے والے نئے اشتراکی معاشی تجربات'' نے اقبال کو اس اُمید سے سرشار کر دیا تھا کہ سائنسی ترقی اور اشتراکی نظریات مسلمانوں پر قرآن حکیم کی انقلابی تعلیمات ایک بار پھر روشن کر کے دُنیائے انسانیت کو سرسبز و شاداب کر سکیں گے۔ اجتہاد پر اپنی گفتگو کو ختم کرتے وقت اقبال نے اپنے عہد کے نوجوان مسلمانوں کو ترغیب دی تھی کہ وہ اجتہاد کی راہوں پر گامزن ہوں:۔

"Equipped with penetrative thought and fresh experience the world of Islam should courageously proceed to the work of reconstruction before them. This work of reconstruction, however, has a far more serious aspect than mere adjustment to modern conditions of life. Humanity needs three things to-day___ a spiritual interpretation of the universe, spiritual emancipation of the individual, and basic principles of a universal import directing the evolution of human society on a spiritual basis."(۹)

گویا اسلام میں دینی تفکر کی نئی تشکیل صرف دُنیائے اسلام ہی کی نہیں بلکہ پوری دُنیائے انسانیت کی ضرورت ہے۔ انسانیت کو کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کی

روحانی نجات اور انسانی معاشرے کو روحانی خطوط پر نشوونما دینے کے لیے آفاقی اصولوں کی اشد ضرورت ہے۔ اسلامی فکر کی نئی تعبیر اس ضرورت کو پورا کر سکتی ہے:۔

"In view of the basic idea of Islam that there can be no further revelation binding on man, we ought to be spiritually one of the most emancipated peoples on earth. Early Muslims emerging out of the spiritual slavery of pre-Islamic Asia were not in a position to realize the true significance of this basic idea. Let the Muslim of to-day appreciate his position, reconstruct his social life in the light of ultimate principles, and evolve, out of the hitherto partially revealed purpose of Islam, that spiritual democracy which is the ultimate aim of Islam."(۱۰)

اقبال کے نزدیک اسلام کا سیاسی نظام روحانی جمہوریت سے عبارت ہے۔ اسلام کا مقصود ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس کی نمایاں ترین پہچان ہر مذہب وملت سے وابستہ افراد کے عقیدہ وعمل کا احترام ہے۔ اگر حکمتِ افرنگ کا مقصود تفریقِ ملل ہے تو اسلام کا مقصود ہے، فقط ملتِ آدم! حکمتِ افرنگ نے دین اور سیاست کی جدائی سے افراد اور اقوام کو آپس میں لڑا کر ان کا استحصال روا رکھا جبکہ اسلام دین اور سیاست کی یکجائی سے انسانی حریت ومساوات کو انسانی معاشرہ کا جلی عنوان بنا دینے کا داعی ہے۔ اقبال نے اسلام میں دین و سیاست کے امتزاج کا مفہوم اپنی نظم "دین و

سیاست'' میں بڑی بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اس نظم میں دین اور سیاست میں جدائی کا منظر بالکل سامنے کی بات ہو کر رہ گیا ہے۔ سیاست کے دین کے تابع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سیاست پر اخلاقی اور روحانی اصولوں کی حکمرانی قائم رہے۔ اردشیر بادشاہ حضرت جنید بغدادیؒ کے تصورِ فقر کا محکوم بن کر رہ جائے۔ اسی بات کو اقبال نے ایک اور مقام پر درویشی با قاہری سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ قوت جو روحانی اصولوں کے تابع نہ ہو'' جہل و جنون'' بن کر رہ جاتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اسی اندھی قوت کا نام ملوکیت پڑ گیا تھا۔ اسلام اس نظامِ ملوکیت کو رد کر کے روحانی جمہوریت کا نظام قائم کرنے کا درس دیتا ہے۔ روحانی جمہوریت کی روح ہر زمانے کی روح کے مطابق جمہوری قالب میں

ڈھلنے کو بے تاب رہتی ہے۔

اقبال کے نزدیک اب تک سلطانیٔ جمہور کا اسلامی تصور صرف جزوی طور پر ہی بروئے کار آ سکا ہے۔ وجہ یہ کہ جس زمانے میں اسلام طلوع ہوا وہ زمانہ جاہلیت کا تھا۔ قرنِ اول کے مسلمان دورِ جاہلیت کی تہ در تہ تاریکیوں سے نکل کر ایوانِ نور میں تازہ تازہ داخل ہوئے تھے۔ تاریخ انسانی میں اس پہلی اسلامی ریاست کے ارد گرد رومی اور ایرانی شہنشاہیت کے طبقاتی نظام قائم تھے۔ دُنیا نے ابھی تک انسانی حریت و مساوات کا سبق سُنا ہی نہ تھا۔ ایسے میں پہلی اسلامی ریاست خُدائی حق حکمرانی کے شاہی تصور سے انکار اور سلطانیٔ جمہور کے اسلامی تصور کے اثبات پر قائم ہوئی۔ ابھی اسلام کے سیاسی تصورات زمانے کے تقاضوں کے مطابق عملی زندگی میں جلوہ گر ہونا شروع ہوئے ہی تھے کہ خلافت ملوکیت بن گئی۔ یوں اسلام کا سیاسی نظام بس جزواً ہی سامنے آ سکا۔ مسلمانوں میں ملوکیت کے زوال کے آثار پیدا ہوئے تو یورپ کی استعماری قوموں نے اسلامی مشرق کو مغربی ملوکیت کے جال میں پھنسا لیا۔ دُنیائے انسانیت پر ملوکیت کے اس تسلط نے نوعِ انسان کے استحصال کو سکۂ رائج الوقت بنا دیا۔ اس انسانی صورتِ حال پر اقبال سراپا احتجاج ہیں:-

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اقبال کے ہاں دینِ اسلام کی نئی تشکیل و تعبیر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ نوع

انساں کوظلم و استحصال سے نجات دلائی جائے۔ اپنی فلسفیانہ تحریروں میں اقبال نے اسلام کو دُنیائے انسانیت کے لیے ایک پیغامِ نجات بنا کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ اُن کی نظر میں:۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو

اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

کائنات کی روحانی تعبیر اور فرد کی روحانی آزادی سیاسی نظام اور سیاسی عمل کو محبت اور اخوت، آزادی اور مساوات کے آفاقی روحانی تصورات کی بُنیاد پر قائم کیے بغیر ناممکن ہے۔ اسی لیے اقبال آج کے مسلمان کو اپنی قدیم دینی فکر کی نئی عصری تعبیر و تفسیر کا فریضہ یاد دلاتے ہیں۔ اقبال کا ہم سے سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ہم آج کے ترقی یافتہ عہد کی علمی اور تحقیقی فتوحات سے روشنی لے کر قرآن حکیم کی تعلیمات کو اپنی جدید اور تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی زندگی کے متحرک قالب میں مسلسل ڈھالتے چلے جانے کی ذمہ داری کو قبول کریں۔ اقبال کے نزدیک ختم نبوت کے تصور کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ مسلمان روحانی طور پر دُنیا میں سب سے زیادہ آزاد "Most Emancipated" بندگانِ خدا ہیں۔ اب اُن کے ہاں نہ کوئی نیا پیغمبر آئے گا، نہ کوئی نئی شریعت آئے گی اور نہ ہی آسمانوں سے کوئی نیا خدائی پیغام نازل ہوگا۔ دین تو مکمل ہو چکا ہے مگر انسان کے عقلی اور باطنی علوم مکمل نہیں ہوز تشنۂ تکمیل ہیں، مگر مسلسل ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں۔

آج مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ عقل و حکمت کی اس ترقی کو کام میں لا کر قرآن حکیم کی ابدی تعلیمات کو اجتہاد کے زندہ و پائندہ مسلک پر قائم رہتے ہوئے سمجھتے اور نافذ کرتے چلے جائیں۔ اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دروازہ تو خود رسول کریم ﷺ نے کھولا تھا۔ جس دروازے کو آنحضور نے کھولا تھا اُسے بند کرنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟۔

حواشی

(۱) سید عبدالواحد (مرتب)، Thoughts and Reflections of Iqbal، لاہور، ۱۹۶۳ء، (ص ۱۹۶)

(۲) ایضاً۔ (ص ۵۳۔۵۴)۔

(۳) محمد اقبال، The Reconstruction of Religious Thought in Islam۔ لاہور، ۱۹۶۶ء، (ص ۱۰۰۔۱۰۱)

(۴) سید عبدالواحد (مرتب)، (ص ۴۷)

(۵) محمد اقبال۔ "Stray Reflections" لاہور، ۱۹۶۱ء۔ (ص ۱۵۷ تا ۱۹۳)۔ اس مختصر تحریر کا آخری پیراگراف درج ذیل ہے۔

"History knows but one monarch whose rule over men may justly be called a rule by divine right and that one man was the Prophet of Islam. And yet, though the ruler of men by divine right, he never claimed to be a ruler. "I am but a man like you," was the grand message of this greatest of kings to an adoring humanity."

(۶) اور (۷) محمد اقبال، The Reconstruction........، (ص ۱۳۷۔۱۳۸)۔

(۸) محمد اقبال، "Stray Reflections"، (ص ۱۳۹)

(۹ اور ۱۰) محمد اقبال، "The Reconstruction......"، (ص ۱۴۲)

اقبال کی حکمت اور حکمتِ عملی

اقبال ابدی صداقتوں کے پیامبر بھی ہیں اور بدلتی ہوئی حقیقتوں کے ترجمان بھی۔ اقبال کے نزدیک زندگی کا کارواں مسلسل آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ کائنات اور قافلۂ حیات کے مسلسل تغیر آشنا ہونے کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ انسان بھی مسلسل خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ کسی مقام پر بھی تھم کر اور جم کر نہ رہ جائے۔ ''یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا/ قومیں کچل گئی ہیں اس کی رواروی میں۔'' فرانسیسی مفکر برگساں زندگی کی اس حرکت پسندی کو تکرارِ مسلسل سے تعبیر کرتا ہے۔ اقبال اس نقطۂ نظر کو حرکت پسندی کی حد تک تو تسلیم کرتے ہیں مگر اسے تکرارِ مسلسل (Eternal Recurrence) کی بجائے تجدیدِ مسلسل (Perpetual Becoming) قرار دیتے ہیں:-

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

اقبال کے نزدیک تجدید اور ترقی کا سفر ہر لحظہ جاری رہنا چاہیے جو فرد اور جو قوم تجدید و ترقی کا یہ سفر ختم کر دیتی ہے۔ زندگی کا تیز گام کارواں اُسے کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ یہ کائنات خالقِ اکبر کی تخلیق ہے۔ اس کائنات کا خالق سوچ

سمجھ کر اور منصوبہ بندی کے ساتھ تخلیق مسلسل میں مصروف ہے۔ چنانچہ کائنات میں ہر نیا تخلیقی نقش پہلے سے زیادہ نکھرا اور سنورا ہوا ہوتا ہے۔ انسان کو بھی اپنے خالق اکبر کی پیروی میں خوب تر اور مکمل تر کی تلاش ہمیشہ جاری رکھنی چاہیے۔

زندگی کے بارے میں اس ارتقائی نقطہ نظر کو اقبال دوامی اور وقتی ہر دو زاویوں سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن حکیم کی ابدی تعلیمات تو اٹل ہیں۔ ان میں کبھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں مگر ان بنیادی تعلیمات پر قائم رہتے ہوئے انھیں بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں اور نئے علوم کی روشنی میں ہمیشہ از سرِ نو تفسیر کرنے کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ اپنے فلسفیانہ خطبات میں انھوں نے اس عمل کو بڑے بلیغ انداز میں (Perpetual change in permanance) سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال کے خیال میں ہر نئی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے عہد کے علمی آفاق کی سیاحی اور اپنے زمانے کے مخصوص مطالبات کی روشنی میں ان ابدی تعلیمات پر از سرِ نو غور کرے۔ دائمی حکمت سے تو ضرور وابستہ رہے مگر عارضی حکمتِ عملی کو ہر آن بدلتی ہوئی زندگی کی ضروریات کے مطابق مسلسل بدلتی رہے۔

ہمارے ہاں تقلید کی روش عام ہے۔ اجتہاد بڑی حد تک شجرِ ممنوعہ بن کر رہ گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہم پاکستان کی نظریاتی اساس کے باب میں بھی بنیادی اور اٹل حکمت اور تغیر آشنا حکمتِ عملی میں فرق کرنا بھول بیٹھے ہیں۔ حکمت دائمی ہے مگر حکمتِ عملی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ ابدی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے حکمتِ عملی کو وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلنا زندگی کا بنیادی تقاضا ہے۔ (۱)

۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے، برٹش انڈیا میں اسلامیانِ ہند کی منزل قیامِ پاکستان تھی۔ اس منزل پر پہنچنے یعنی حصولِ پاکستان کی خاطر برطانوی ہند میں جو حکمتِ عملی وضع کی گئی تھی قیامِ پاکستان کے بعد وہ حکمتِ عملی کام نہیں دے سکتی۔ اُس حکمتِ عملی کے بنیادی عناصر دو تھے جداگانہ انتخابات اور زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری ۔جداگانہ مسلمان قومیت کی تشکیل و تعمیر کے لیے جداگانہ انتخابات بھی ناگزیر تھے اور

زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ بھی مرکزی حکومت کو ناکام بنا دینے کا ایک مؤثر حربہ تھا۔

بات یہ ہے کہ جب تک ہندوستان تقسیم نہ ہوتا اس وقت تک جداگانہ مسلمان مملکتیں وجود میں نہ آ سکتی تھیں۔ دوامی حقیقت قیامِ پاکستان تھا۔ جداگانہ انتخابات ہندوستان کو تقسیم کرنے کی ایک وقتی اور عارضی حکمتِ عملی تھی۔ یہ عارضی حکمتِ عملی برٹش انڈیا کے لیے مخصوص تھی۔ اس حکمتِ عملی نے برٹش انڈیا کو عملاً مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے نتائج نے اس تقسیم پر صداقت کی مُہر ثبت کر دی۔ انتخابات کے بعد برطانوی حکومت اور انڈین نیشنل کانگرس اپنی متحدہ حکمتِ عملی سے بھی اس تقسیم کو منسوخ کرنے میں ناکام رہیں۔ یوں ایک عوامی جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان قائم ہو گیا۔ جداگانہ مسلمان قومیت کی حکمت اور جداگانہ انتخابات کی حکمتِ عملی قیامِ پاکستان تک لازم وملزوم تھی۔ جب پاکستان قائم ہو گیا تو جداگانہ مسلمان قومیت کا تصور خود بخود متحدہ پاکستانی قومیت کی شکل اختیار کر گیا۔ حکمت وہی رہی جو کل فقط ایک تصور تھی اور آج پاکستان کے جغرافیائی وجودکی شکل میں تصورِ پاکستان کی تجسیم سے عبارت ہے۔ کل ہم قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں مصروف تھے اور آج ہمیں استحکامِ پاکستان کا چیلنج درپیش ہے۔ آج دوقومی نظریے کی ابدی حکمت تو جوں کی توں ہے مگر جداگانہ طرزِ انتخاب کی حکمتِ عملی غیر ضروری ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کی صورت حال میں وہ پرانی حکمتِ عملی نہ صرف غیر ضروری بلکہ نقصان دہ بن گئی ہے۔

تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ہم برطانوی ہند کو توڑنا چاہتے تھے۔ جداگانہ طریقِ انتخاب توڑنے کی حکمتِ عملی تھی، جوڑنے کا، استحکام بخشنے کا نسخۂ شفا ہرگز نہ تھا۔ آج اگر ہم برطانوی ہند میں اپنائی گئی حکمتِ عملی کو پاکستان کے اندر اپنائیں گے تو لامحالہ پاکستانی قوم تقسیم ہوگی، پاکستان ٹوٹے گا جبکہ یہ ہمارا مقصد ہرگز نہیں۔ ہم پاکستان کو متحد اور مستحکم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے آج ہمیں مخلوط طرزِ انتخاب کی

حکمت عملی کو اپنانا ہوگا۔ اس لیے کہ مخلوط انتخابات متحدہ پاکستانی قوم کو اور زیادہ متحد اور مستحکم بنانے کی حکمت عملی ہے۔ جو لوگ آزاد اور خود مختار پاکستان کے اندر غلام ہندوستان میں مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کی خاطر اپنائی گئی اس حکمت عملی کو صرف اس وجہ سے اپنائے رہنا چاہتے ہیں کہ انھیں بانیانِ پاکستان کی کورانہ تقلید پر ناز ہے انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اگر خود اقبال زندہ ہوتے تو وہ حسبِ دستور اجتہاد کی راہ اپناتے ہوئے جداگانہ کی بجائے مخلوط انتخابات کی حکمتِ عملی اپنا لیتے۔

خطبۂ الہ آباد کے دوران اقبال نے یہ اشارہ دے رکھا ہے کہ جداگانہ انتخابات پر اصرار ایک عارضی حکمت عملی ہے جو برطانوی ہند میں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی مخصوص صورتِ حال میں وضع کی گئی ہے۔ اقبال جداگانہ انتخابات کے خلاف برطانوی وزیر اعظم کے نقطۂ نظر کو رد کرتے وقت بتاتے ہیں کہ ایک ایسی سلطنت میں جہاں کئی قومیں آباد ہوں وہاں ہر قوم کے لیے جداگانہ انتخابات کا انعقاد لازمی ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا برطانوی ہند میں مسلمان جداگانہ طرزِ انتخاب پر اس لیے اصرار کر رہے تھے کہ اپنے جداگانہ قومی دائرے میں وہ ایک جداگانہ جمہوری نظام کے قیام کا حق رکھتے تھے:-

"The Prime Minister of England apparently refuses to see that the problem of India is international and not national. He is reported to have said that this Government would find it difficult to subit to Parliament proposals for the maintenance of separate electorates, since joint electorates were much more in accordance

with British democratic sentiments. Obviously he does not see that the model of British democracy cannot be of any use in a land of many nations; and that a system of separate electorates is only a poor substitute for a territorial solution of the problem."[2]

اوپر دیے گئے اقتباس سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی ہے کہ برطانوی ہند میں چونکہ کئی قومیں آباد تھیں اس لیے مسلمان قیادت نے مسلمان قوم کے لیے جداگانہ طرزِ انتخاب کی حکمتِ عملی اپنائی تھی۔ اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب جبکہ مسلمان قوم نے اپنا ایک قومی وطن قائم کر لیا ہے تو اس وطن کے جمہوری نظام میں جداگانہ طرزِ انتخاب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب اس وطن کے اتحاد کی خاطر مخلوط انتخابات کا طریق اپنانا ضروری ہو کر رہ گیا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی خطبۂ الہ آباد میں یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ اُن مسلمان ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں جداگانہ مسلمان قومیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جداگانہ مسلمان قومیت اور جداگانہ طرزِ انتخابات کا سوال صرف اُن ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں۔ اسی بات کو انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مضامین (مطبوعہ ماڈرن ریویو، کلکتہ) میں اُٹھائے گئے سوالات کے جواب میں بھی بہ اندازِ دگر لکھ رکھا ہے:-

"Nationalism in the sense of love of one's country and even readiness to die for its honour is a part of the Muslim's faith: it comes into conflict with Islam only when it

begins to play the role of a political concept and claims to be a principle of human solidarity demanding that Islam should recede to the background of a mere private opinion and cease to be a living factor in the national life. In Turkey, Iran, Egypt and other Muslim countries it will never become a problem. In these countries Muslims constitute an overwhelming majority and their minorities, i.e., Jews, Christians and Zoroastrians, according to the law of Islam, are either "People of the Book" or "like the People of the Book" with whom the law of Islam allows free social relations including matrimonial alliances. It becomes a problem for Muslims only in countries where they happen to be in a minority, and nationalism demands their complete self-effacement. In majority countries Islam accomodates nationalism; for there Islam and nationalism are practically identical; in minority countries it is justified in seeking self-determination as

a cultural unit. In either case, it is thoroughly consistent with itself." (3)

آج، بحمد للہ، پاکستان میں ہم مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں اور اس مملکتِ خداداد میں ہمارے دین، ہماری تہذیب اور ہمارے تصورِ کائنات کو کسی دوسرے دینی یا تہذیبی گروہ سے کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔ پاکستان میں بڑی اقلیتوں کا تعلق بھی اہلِ کتاب سے ہے۔ نہ ہم پاکستانی قوم کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی پاکستان کو۔ ہم تو پاکستان کو متحد اور مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے آج آزاد پاکستان میں ہمیں دورِ غلامی کی حکمتِ عملی کو ترک کر دینا پڑے گا اور اس کی جگہ دورِ آزادی کی حکمتِ عملی اپنانا پڑے گی۔ آج ہماری زندگی دورِ غلامی کو بہت پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہماری سیاسی زندگی بالکل بدل کر رہ گئی ہے اس لیے ہمیں اپنی سیاسی حکمتِ عملی کو بھی دورِ آزادی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ طریق انتخاب کی حد تک اب ہمیں جداگانہ کی بجائے مخلوط طریقِ انتخاب کی حکمتِ عملی اپنانا پڑے گی۔

برطانوی ہند کے برعکس آج ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جو کئی قوموں کا نہیں بلکہ فقط ایک پاکستانی قوم کا مسکن ہے۔ اس لیے اب ہمیں مسلمان اکثریت کے ممالک کی حکمتِ عملی اپنانا پڑے گی کیونکہ بقول اقبال ان ممالک میں اسلام اور نیشنلزم ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مخلوط طرزِ انتخاب کی یہی حکمتِ عملی آج ہمارے قومی اتحاد اور استحکام کی ضامن بن سکتی ہے۔ نئی حکمتِ عملی وضع کرتے وقت یہ بات ہرگز فراموش نہ ہو کہ ہم دوقومی نظریہ کی بنیادی اور ابدی حکمت پر قائم ہیں۔ کل اس حکمت نے ہمیں پاکستان دیا تھا۔ آج یہی بنیادی حکمت ہمارے پاکستان کی فکری بنیاد کے دوام کا سرچشمہ ہے۔ ابدی حقیقت پاکستان ہے۔ بدلتے ہوئے حقائق میں سے ایک حقیقت طریقِ انتخاب ہے۔ اسے پاکستان کی ابدی حقیقت کو سنوارنے، نکھارنے اور سرسبز و شاداب رکھنے کی خاطر ہر نئے موسم میں

بدلتے رہنا چاہیے۔ اجتہاد کی یہی وہ شاہراہ ہے جس پر ہمیں مفکرِ پاکستان علامہ اقبال نے چلنا سکھایا تھا۔ ایسے میں ہمیں چاہیے کہ ہم اقبال کی اس وارننگ کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں:۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی!

حواشی

(۱) اسلام میں دینی فکر کی نئی تشکیل کے موضوع پر اپنے مشہور خطبات "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں اقبال مسلمان معاشروں میں اجتہاد کی مرکزی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"The ultimate spiritual basis of all life, as conceived by Islam, is eternal and reveals itself in variety and change. A society based on such a conception of Reality must reconcile, in its life, the categories of permanence and change. It must possess eternal principles to regulate its collective life, for the eternal gives us a foothold in the world of perpetual change. But eternal principles when they are understood to exclude all possibilities of change which, according to the Qur'an, is one of the greatest 'signs' of God, tend to immobilize what is essentially mobile in its nature. The failure of the Europe in political and social sciences illustrates the former principles, the immobility of Islam during the last five hundred years illustrates the later. What then is the principle of movement in the structure of Islam? This is known as Ijtihad." (Edition: 1996, Lahore, P.117)

(۲) سید عبدالواحد، "Thoughts and Reflections of Iqbal"، ۱۹۲۴ء، ص ۱۸۸۔

(۳) ایضاً، ص ۲۸۸۔۲۸۷۔

اقبال اور ہمارا قومی مقدر

علامہ اقبال نے ہوش سنبھالتے ہی مسلمان معاشروں کو جن بیماریوں میں مبتلا پایا اُن میں سے ایک مہلک بیماری کا نام مقدر پرستی ہے۔ انسان کی تقدیر کے بارے میں یہ تصور راسخ ہو چکا تھا کہ ہر شخص پیدائش کے وقت اپنا مقدر ساتھ لاتا ہے۔ یہ مقدر کسی صورت میں بھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی انسانی جد و جہد انسان کے مقدر کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ آدمی کو غربت سے لے کر غلامی تک ہر چیز کو تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر چپکے چپکے برداشت کرتے رہنا چاہیے۔ اقبال مقدر پرستی کے اس تصور کو قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے منافی قرار دیتے ہیں:-

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خُدا کی تقدیر

مسلمانوں میں تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہنے کے اس چلن کو اقبال شہنشاہیت کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ ''انسانی انا کی آزادی اور ابدیت'' کے فلسفیانہ موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال مقدر پرستی کے غیر اسلامی طرزِ عمل کے اسباب پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:-

"But is it not true, you will say, that a

most degrading type of Fatalism has prevailed in the world of Islam for many centuries? This is true, and has a history behind it which requires separate treatment. It is sufficient here to indicate that the kind of Fatalism which the European critics of Islam sum up in the world Qismat was due partly to philosophical thought, partly to political expediency, and partly to the gradually diminishing force of the life-impulse, which Islam originally imparted to its followers. The practical materialism of the opportunist Umayyad rulers of Damascus needed a peg on which to hang their misdeeds at Karbala, and to secure the fruits of Amir Mu'awiyah's revolt against the possibilities of a popular rebellion. Ma'bad is reported to have said to Hasan of Basra that the Umayyads killed Muslims, and attributed their acts to the decrees of God. 'These enemies of God', replied Hasan, 'are liars.' Thus arose, in spite of open protests by Muslims divines, a

morally degrading Fatalism, and the constitutional theory known at the 'accomplished fact' in order to support vested interests."(1)

اقبال کے نزدیک مسلمانوں میں مقدر پرستی کا مروجہ غیر اسلامی تصور ملوکیت کی دین ہے۔ مستبد اور جابر حکمرانوں نے اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ کی خاطر مقدر پرستی کے اس مذموم تصور کو رواج دیا۔ اُن کے خیال میں یہ تصور اموی دور میں حکمرانوں کی ایک سیاسی ضرورت تھا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر قرآنی تعلیمات کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا۔ قرآنی تعلیمات کو درست تناظر میں پیش کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:۔

"Pure time, then, as revealed by a deeper analysis of our conscious experience, is not a string of separate, reversible instants; it is an organic whole in which the past is not left behind, but is moving along with, and operating in, the present. And the future is given to it not as lying before, yet to be traversed; it is given only in the sense that it is present in its nature as an open possiblity. It is time regarded as an organic whole that the Qur'an describes as Taqdir or the destiny__a word which has been so much misunderstood both in and outside the

world of Islam. Destiny is time regarded as prior to the disclosure of its possibilities."(۲)

اقبال نے اپنے استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے مقدر کو بیج سے تشبیہ دی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جس طرح بیج کے اندر پورا درخت موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص کی ذات میں اللہ نے وہ امکانات رکھ دیئے ہیں جنھیں وہ اپنی محنت سے بروئے کار لاسکتا ہے۔ جس طرح بیج ڈالنے کے بعد اگر کسان محنت نہ کرے تو بیج مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائے گا، کونپل نہیں پھوٹے گی۔ اس کے برعکس محنت سے بیج کے اندر سے کونپل پھوٹ نکلے گی۔ پھر بادِ سازگار، آبیاری اور محنت کے ساتھ وہی بیج ایک چھتنار درخت کی صورت اختیار کر جائے گا۔ اسی طرح انسانی فطرت میں ودیعت کیے گئے امکانات کو اگر کوئی شخص اپنی محنت سے، اپنی جہدِ مسلسل سے پروان نہیں چڑھائے گا تو اُس کا مقدر چھوٹ جائے گا اور وہ ترقی نہیں کر پائے گا مگر جو شخص اللہ کے دیئے ہوئے ان امکانات کو بروئے کار لانے کے لیے مشکلات و مصائب سے پنجہ آزما ہوتا رہے گا وہ مسلسل ترقی کرتا چلا جائے گا۔ یہی حال قوموں کے مقدر کا بھی ہے۔ جو قومیں اللہ کے دیئے ہوئے وسائل کو قومی نظم و ضبط کے ساتھ محنت کرتے ہوئے مسلسل بروئے کار لاتی رہیں گی اُن قوموں کا مستقبل بھی مسلسل سنورتا ہی چلا جائے گا۔ جو افراد اور اقوام محنت و مشقت اور جہدِ مسلسل سے کام نہیں لیتیں اُن کی مثال اُس بیج کی سی ہے جو زمین کے اندر ہی مر کر رہ جاتا ہے۔

علامہ اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کا مقدر اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ انسان اپنے مقدر کی خرابی کی ذمہ داری خدا پر نہیں ڈال سکتا۔ اس خرابی کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے فلسفہ اور اپنی شاعری ہر دو میدانوں میں مقدر پرستی کے اس تصور کی تردید بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔ اقبال نے فلسفیانہ سطح پر بھی عقلی دلائل کے ساتھ مقدر پرستی کی تردید کی ہے اور اپنی شاعری کے فیضان سے بھی دُنیائے

اسلام کو اس بیماری سے نجات دلانے کے لیے خوب کام لیا ہے۔ وہ دُنیائے اسلام سے پوچھتے ہیں:-

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا؟
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے زار و زبوں

اور پھر خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہیں:-

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر!
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ!

تاریخ شاہد ہے کہ خود اقبال ایک ایسے فرد ثابت ہوئے جنہوں نے اپنے فکر وعمل سے اپنی قوم کے مقدر کو بدل کر رکھ دیا۔ علامہ اقبال اس اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں کہ نہ تو اُن سے پہلے اور نہ ہی اُن کے بعد، آج تک کی پوری انسانی تاریخ میں کوئی، ایسا شاعر گزرا ہے جس کے افکار سے ایک نئے ملک کا جغرافیائی وجود پھوٹا ہو۔ پاکستان اقبال کی اسلامی انقلابی شاعری کا بدن ہے۔ قائداعظم کے سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو نے کُل ہند مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور کے حوالے سے لکھا ہے کہ:-

"اس اجلاس کے کچھ عرصے بعد جناح نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری مطلوب الحسن سید سے جو لاہور کے اجلاس میں شریک تھے کہا۔ اقبال اگر آج زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ہم نے بالآخر وہی فیصلہ کیا جس کی انہیں آرزو تھی......"(۳)

یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کا یہ اجلاس قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد یومِ اقبال کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یومِ اقبال کی پہلی نشست چوبیس ہی کی شام کو منعقد ہوئی جس کی صدارت قراردادِ پاکستان پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے والے بنگال کے وزیرِاعلیٰ مولوی اے کے فضل الحق نے فرمائی تھی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انہوں نے اعتراف کیا کہ:-

''اقبال نے ہم کو ایک پیغام دیا ہے..... پاکستان کی اسکیم کا پہلے اقبال نے تصور پیش کیا تھا جس کو آج آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک مطالبہ کی صورت میں منظور کر لیا ہے۔''(۴)

دوسرے اجلاس کی صدارت خود قائداعظم نے فرمائی اور اقبال سے اپنی گہری سیاسی اور ذاتی رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے اے کے فضل الحق کے اعتراف کی تائید فرمائی۔ خود اقبال نے اپنے قومی کارناموں کی جانب اپنے درج ذیل شعر میں بڑا بلیغ اشارہ کیا ہے:-

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
وہ اِک مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

اقبال برطانوی ہند کے ایک محکوم شہری تھے۔ اپنی اور اپنی قوم کی محکومی کا خیال اُن کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اقبال انسانی ارادہ وعمل کی آزادی کے بہت بڑے مغنی تھے مگر جب وہ اپنے مثالی تصورات کو غلامی کی سفاک حقیقت کے سیاق وسباق میں دیکھتے تھے تو اُن کے دل میں قومی آزادی کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہونے کا عزم اور بھی زیادہ پختہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ وہ عمر بھر بڑے استقلال کے ساتھ قومی آزادی کی جدوجہد میں فکری اور عملی طور پر شریک رہے۔ جب انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی تو انھیں گردوپیش کی زندگی پر غلامی کے بھیانک اثرات کارفرما نظر آئے۔ اُن کے دل میں قوم کی بے حسی اور بے عملی کا رنج اس قدر شدید تھا کہ انھوں نے اپنی ایک مختصر نظم میں اپنی ذات پر اللہ میاں کے الطاف وعنایات کا شکر ادا کرنے کے بعد یہ گلہ کرنا بھی ضروری سمجھا:-

لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند!

اقبال نے غلامی کی اس تیرہ وتار فضا میں اپنا فنی وفکری مجاہدہ اس عزم و استقلال کے ساتھ شروع کیا تھا کہ:-

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

چنانچہ اقبال کی شاعری نے اسلامیانِ ہند کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، مشکلات و مصائب سے مردانہ وار پنجہ آزما ہونے کو تیار کیا، انہیں اپنی منفرد اور جداگانہ ہستی کا شعور بخشا، پھر اپنی اس جداگانہ ہستی کی بقا اور استحکام کی خاطر قومی جمود کو توڑ کر حرکت و عمل پر آمادہ کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے سامنے کامل آزادی اور دائمی بقا کا ایک واضح انقلابی نصب العین رکھا:-

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان!

تاریخ نے مقدر کے اس ستارے کو تصورِ پاکستان کا نام دیا ہے۔ ہندی مسلمانوں کو بیک وقت برطانوی استعمار اور کانگریسی استبداد سے آزادی کی راہ پر گامزن ہونے کا مشورہ دیتے وقت اقبال نے سن ۱۹۳۰ء میں پیشگوئی فرمائی تھی کہ پاکستان کا قیام مقدر ہو چکا ہے۔ اپنے خطبۂ الہ آباد میں اقبال نے دوٹوک انداز میں اعلان کیا تھا کہ ہندی مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ وہ جدید معنوں میں ایک الگ مسلمان قوم ہیں۔ چنانچہ اسلامیانِ ہند کو چاہیے کہ وہ مستقبل کے اکھنڈ بھارت میں تحفظات کی بھیک مانگنے کی بجائے قوموں کے حقِ خود اختیاری کی رُو سے اپنی الگ قومی ریاستیں قائم کرلیں۔ اسلامیانِ ہند نے اپنے مقدر کے اس ستارے کو خوب پہچانا۔ صرف سترہ برس کی مسلسل اجتماعی جدوجہد کے بعد پاکستان قائم ہوگیا۔

پاکستان کا قیام ایک عوامی جمہوری تحریک سے عمل میں آیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اقبال کے تصورِ پاکستان کو پاکستان کی عملی زندگی میں نافذ کرنا ہمارا اولین فریضہ تھا مگر سانحہ یہ ہوا کہ بابائے قوم کی وفات اور وزیرِاعظم لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد اقتدار سول اور فوجی افسر شاہی کے گھر کی کنیز بن کر رہ گیا۔ اقبال کا

تصورِ پاکستان ایک انقلابی تصور ہے۔ سیاسی، معاشی اور روحانی جمہوریت کا قیام اس تصور کے نفاذ کی جانب پہلا قدم ہے مگر قیام پاکستان کے صرف چند برس بعد ہمارے ہاں پہلی فوجی آمریت قائم ہوگئی۔ فوجی آمریت سلطانیٔ جمہور کی ضد ہے۔ تصورِ پاکستان آمریت کے تسلط کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے آمروں نے اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ کی خاطر تصورِ پاکستان کو دھندلانا شروع کر دیا۔

ضیاء الحق کے دورِ اقتدار میں مطالعۂ پاکستان کو ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیمی نصاب میں جگہ دی گئی۔ ثانوی جماعتوں کے لیے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی شائع کردہ کتاب میں تصورِ پاکستان کی بجائے نظریۂ پاکستان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ نظریۂ پاکستان کو درج ذیل الفاظ میں متعارف کرایا گیا:۔

> ''ہر معاملے میں اصل معیار اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یعنی قرآن و سنت ہوتا ہے۔ مسلم قوم کا یہی نظریۂ حیات، تحریکِ پاکستان کی اساس بنا۔ پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اور یہ نظریہ مسلمانوں کا دینِ اسلام ہے۔ یہی نظریہ پاکستان کا مفہوم ہے۔ گویا یہاں سیاسی، معاشی، معاشرتی غرضیکہ پوری زندگی کا نظام اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ہوگا اور ہر معاملے میں رہنمائی قرآن اور سنت رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کی جائے گی۔''(۵)

یہ فقط اوپر دیے گئے اقتباس پر ہی موقوف نہیں بلکہ ساری کی ساری کتاب میں اور خصوصاً ''قیامِ پاکستان'' کے باب میں بڑی محنت اور کمال ذہانت کے ساتھ فکری انتشار کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔ اس درسی کتاب میں نظریۂ پاکستان کی وضاحت یوں کی گئی ہے:۔

> ''پاکستان ایک نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ یہ نظریہ مسلمانوں کا دینِ اسلام ہے۔ یہی نظریۂ پاکستان کا مفہوم ہے۔''

سوال یہ ہے کہ اگر دینِ اسلام ہی نظریۂ پاکستان ہے تو کیا تمام مسلمان ممالک نظریۂ پاکستان ہی پر قائم ہیں؟ کیا بھارت کے مسلمان بھی نظریۂ پاکستان پر قائم ہیں؟ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد سے لے کر ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان تک اور پھر قرارداد سے لے کر قیامِ پاکستان تک برصغیر کی مذہبی سیاسی جماعتوں نے تحریکِ پاکستان کی فکری اور عملی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ کیا وہ بھی نظریۂ پاکستان پر کاربند تھیں؟ دم تو وہ بھی دینِ اسلام ہی کا بھرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ افغانستان، ایران، ترکی، جزیرہ نمائے عرب کی تمام ریاستیں، مغربِ اقصیٰ کی مختلف مسلمان ریاستیں نظریہ پاکستان پر ہرگز قائم نہیں۔ ہاں دینِ اسلام پر ضرور قائم ہیں۔ اسی طرح برصغیر کی جن مذہبی سیاسی جماعتوں نے تحریکِ پاکستان کی بڑی شدومد کے ساتھ مخالفت کی تھی وہ بھی دینِ اسلام کی منکر نہ تھیں صرف دوقومی نظریہ یعنی جداگانہ مسلمان قومیت کے تصور سے انکاری تھیں۔

بلاشبہ ہم سب کا دین ایک ہے مگر ممالک جُدا جُدا ہیں۔ پاکستان دوقومی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ یہ نظریہ برٹش انڈیا کے علاوہ کسی اور ملک میں پیدا ہی نہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے کہ دیگر مسلمان ملکوں کی صورتِ حال برٹش انڈیا کے مسلمانوں سے بالکل مختلف تھی۔ متذکرہ بالا ممالک کے مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہاں اُن کے دین، اُن کی تہذیب اور اُن کی اجتماعی ہستی کو کسی اقلیت سے کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے برعکس برٹش انڈیا کے مسلمان اقلیت میں تھے اور یہاں اُن کی اجتماعی ہستی کو ایک اندھی اکثریت کی جارحانہ یلغار کا سامنا تھا۔ اپنی اجتماعی شناخت کو مٹنے سے بچانے کی خاطر یہاں انھوں نے متحدہ ہندوستانی قومیت کو رد کر کے ایک جداگانہ مسلمان قومیت کا تصور اپنایا تاکہ وہ اپنے لیے جداگانہ قومی وطن حاصل کر سکیں۔

جداگانہ مسلمان قوم کا یہ تصور سب سے پہلے اپنی نکھری ستھری اور قطعی شکل میں علامہ محمد اقبال نے ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔ اس تصور نے مسلمان عوام کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں اس تصور کو ایک سیاسی پروگرام کی شکل دی گئی۔ اس

سیاسی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر ایک عوامی جمہوری جدوجہد کا آغاز کیا گیا۔ سات سال کی کٹھن جدوجہد کے بعد بالآخر پاکستان وجود میں آ گیا۔ پہلے تصورِ پاکستان، پھر تحریکِ پاکستان اور بالآخر قیامِ پاکستان .... یہ ہیں ہماری قومی سیاسی اور تہذیبی جدوجہد کے تین مرحلے۔ ان میں سے ہر ایک مرحلے پر غیروں نے ہی نہیں، اپنوں نے بھی یعنی خود مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں نے بھی دینِ اسلام کے نام پر قیامِ پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ یہ مخالفانہ جدوجہد تحریکِ پاکستان کا حصہ ہے۔ اس لیے آج جب ہم اپنے بچوں کو یہ پڑھاتے ہیں کہ نظریہ پاکستان کا مطلب ہے دینِ اسلام تو بڑا ظلم کرتے ہیں۔

پاکستان کا تصور بلاشبہ دینِ اسلام کی جدید انقلابی تعبیر سے پھوٹا ہے۔ یہ جدید انقلابی تعبیر ایک خاص شخص محمد اقبال نے ایک خاص وقت ۱۹۳۰ء میں اور ایک خاص مقام الہ آباد میں دوقومی نظریے کی صورت میں پیش کی تھی۔ پھر دس برس بعد برٹش انڈیا ہی کے مسلمانوں نے قائدِاعظم کی قیادت میں اس تصور کو اپنانے کا اعلان کیا تھا۔ یہ اعلان بھی برٹش انڈیا ہی کے ایک شہر لاہور میں، جدید آئینی اصطلاحات میں کیا گیا تھا۔ اس اعلان کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر برطانوی ہند کے طول وعرض میں ایک عوامی جمہوری تحریک چلائی گئی تھی اور یوں سیاسی عمل کے ذریعے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔ یہ سادہ سی کہانی آسان سے لفظوں میں اپنے بچوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ ایسا کرنے سے مسلسل ڈرتا چلا آ رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ تصورِ پاکستان کو سادہ و آسان، سچے اور سیدھے انداز میں پیش کرنے سے کیوں خائف ہے؟ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ حقیقی تصورِ پاکستان کو جمہوریت، معاشی انصاف، سیاسی آزادی اور قومی خودمختاری کے جدید انسانی تصورات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تصورات ہمارے حکمران طبقے کے مخصوص مفادات کے لیے موت کا پیغام ہیں اور موت سے کون نہیں ڈرتا؟ ....

گزشتہ نصف صدی کے دوران ہمارے حکمران وقتاً فوقتاً اپنے اپنے نظریۂ ضرورت کے مطابق نظریۂ پاکستان ایجاد کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ ایک واضح، قطعی اور توانا تصور کو دھندلاتے دھندلاتے ہم نے اس قدر مبہم بنا دیا ہے کہ آدھے سے زیادہ پاکستان ہم سے چھن چکا ہے اور باقی ماندہ پاکستان میں بیٹھے آج ہم اس فکر میں مبتلا ہیں کہ کہیں ہم اسے بھی گنوا نہ بیٹھیں!

ہماری آج کی مایوسی اور نامرادی کا سب سے بڑا سبب ہی یہ ہے کہ ہم نے تصورِ پاکستان کو اقبال کی انقلابی فکر سے کاٹ کر الگ کر دیا ہے۔ موجودہ فکری اور سیاسی بحران سے نجات کی فقط ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ ہم یہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑیں اور اقبال کی آواز پر کان دھریں:-

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان!

بے شک ہمارا مقدر اقبال کے خیالات کے کارخانے میں ڈھل رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اقبال کی کارگہِ فکر میں جائیں اور وہاں سے اپنے انفرادی اور اجتماعی مقدر کا ستارہ ڈھونڈ نکالیں!

حواشی

(۱) محمد اقبال، The Reconstruction of Religious Thought in Islam، لاہور، 1996، (صفحہ ۳۸)۔

(۲) ایضاً، (صفحہ ۳۹،۴۰)۔

(۳) ولی حیدر ذاکر، بحوالہ "قرارداد پاکستان اور یوم اقبال" مطبوعہ "الفتح" کراچی، (ص۔ ۶۳)

(۴) ایضاً۔ (ص۔ ۶۴)

(۵) مطالعہ پاکستان، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور نومبر ۲۰۰۱، (ص ۷، ۸)۔

اقبال اور معاشی انصاف کی تلاش

اقبال کی طویل نظم ''لینن خُدا کے حضور میں'' بڑی حد تک اقبال کی ممنوعہ شاعری میں شمار ہوتی ہے۔ یہ نظم قارئین ادب میں جتنی مقبول ہے نقادانِ ادب میں اتنی ہی غیر مقبول ہے۔ اس وقت تک اقبال کی طویل نظموں کی تفہیم و تحسین پر مشتمل دو قابلِ قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک بھارت میں اور دوسری پاکستان میں۔ نامور نقاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی کتاب ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' اقبال شناسی میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ ہمارے ہاں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی تصنیف ''اقبال کی طویل نظمیں'' اقبالیات کے طالب علموں میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہے۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ ''لینن خُدا کے حضور میں'' ہر دو کتابوں میں زیرِ بحث نہیں لائی گئی۔ ہمارے میڈیا کے خُداوند بھی اس عظیم نظم کے فیضان سے محروم چلے آ رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا اس نظم سے اُتنا ہی ڈرتا ہے جتنا ہمارے خُداوندانِ مکتب اس سے خوف کھاتے ہیں۔ جو تین طویل نظمیں ''بالِ جبریل'' کی آبرو ہیں یہ نظم اُن میں سے ایک ہے۔ یادش بخیر، جس زمانے میں ''بالِ جبریل'' ایم اے اردو کے نصاب میں شامل تھی اُس زمانے میں بھی اس نظم کو ادبیاتِ اُردو کے نصاب سے باہر رکھنے کا اہتمام کر لیا گیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان میں تہذیب و سیاست کے اربابِ بست و کشاد مفکرِ پاکستان کی اسلامی انقلابی فکر سے پھوٹنے والی اس نظم کو عملاً سنسر شپ کی نذر کیوں

کرتے چلے آ رہے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ معاشی انصاف کے اسلامی تصورات کو عوام کی نظروں سے چھپائے رکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ یہ طبقہ معاشی انصاف کے اسلامی تصورات کو پاکستان میں نافذ نہیں کرنا چاہتا اس لیے وہ ان تصورات کی مقبولیت سے خائف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اقبال کے ہاں معاشی عدل وانصاف کی تلاش کی کہانی اس نظم سے شروع کر رہے ہیں۔

یہ نظم اُن دو تین نظموں میں سے ایک ہے جن میں اقبال کی شاعرانہ صناعی اپنے اوجِ کمال پر نظر آتی ہے۔ اس نظم کی فنی ساخت پرداخت بہت سوچ سمجھ کر کی گئی ہے۔ اس نیم ڈرامائی نظم کا جو تصوراتی ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے وہ تین کرداروں کی گفتگو سے وجود میں آیا ہے۔ یہ تین کردار ہیں: لینن، فرشتے اور خدا۔ وفات کے بعد لینن خُدا کی ہستی پر ایمان لے آتے ہیں اور خُدا کی بارگاہ میں اپنے عمل کا حساب پیش کرتے وقت اپنی دہریت پسندی پر ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔ آیئے پہلے لینن کی زبانی ذاتِ باری کی حقانیت کا بیان سُنیں:-

اے اَنفُس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہُوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تُو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات!

نظم کا یہ ابتدائی حصہ گویا توبہ کا باب ہے۔ لینن اپنی دہریت پسندی کی ذمہ

داری بڑی حد تک مغرب کے سرمایہ داری نظام، اس نظام کے پروردہ علوم وفنون اور اس نظام کی کوکھ سے پیدا ہونے والے فرنگی استعمار پر ڈالتے ہیں۔ ہر دم بدلتے ہوئے نظریات سے عبارت بے خدا تہذیب میں پنپتے ہوئے علوم کی نارسائی کا یہ عالم ہے کہ:-

محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ایک لادین تہذیب کی سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کا حاصل فقط ہلاکت آفرین ہتھیار رہیں۔ فرنگی مدنیت نے اگر ایک طرف بے کاری وافلاس کو پروان چڑھایا ہے تو دوسری جانب عریانی اوراوباشی کو ایک پسندیدہ معاشرتی چلن بنادیا ہے۔ لینن حریمِ کبریا میں اس بے خدا تہذیب کی غارت گری کے خلاف فریاد کرتا ہے:-

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمہ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا

جب رُوح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تُو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خُداوند درخشندہ فلزات

گویا دہریت کے فلسفے کو مغرب کی سرمایہ دارانہ تہذیب نے ہی جنم دیا ہے۔ سرمایہ داری نظام نے خُدا کو دُنیا بھر سے عملاً بے دخل کر رکھا ہے۔ مشرق کے محکوم اپنے فرنگی آقاؤں کی پرستش میں مصروف ہیں تو اہلِ فرنگ زر کی پرستش میں منہمک ہیں۔ ایسے میں لینن خُدا سے یہ چبھتا ہوا سوال پوچھتے ہیں کہ وہ آدم کہاں ہے جو خُدا پرست ہو؟...... سرمایہ داری نظام نے لوگوں کو اپنے استحصالی چنگل میں یوں دبوچ رکھا ہے کہ وہ اپنے خالقِ اکبر تک کو بھول بیٹھے ہیں۔ خُدا کی بارگاہ میں لینن کی یہ فریادِ اُمید اور رجائیت پر آ تمام ہوتی ہے۔ یہ رجائیت مغرب میں اشتراکیت کے ہاتھوں سرمایہ دارانہ نظام کی شکست کے آثار سے پیدا ہوئی ہے۔ فریاد میں یک بہ یک نمودار ہو جانے والی اُمید کی تان بھی ایک سوال پر آ ٹوٹتی ہے۔ وہ آتشیں سوال یہ ہے کہ روزِ مکافات کب آئے گا اور سرمایہ پرستی کا سفینہ کب ڈوبے گا؟:۔

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بُنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دُنیا ہے تری منتظر اے روزِ مکافات!

بارگاہ خداوندی میں لینن کی فریاد کو فرشتے بھی چپکے چپکے مگر بڑے انہماک کے ساتھ سُن رہے تھے۔ لینن کے اُٹھائے ہوئے درج بالا آخری سوال تک پہنچتے پہنچتے وہ اتنے جذباتی ہو گئے کہ انھوں نے بے ساختہ لینن کی ہم نوائی شروع کر دی۔ نظم کا یہ حصہ فرشتوں کے گیت پر مشتمل ہے۔ فرشتوں کے خیال میں خلق خدا پر اس پیہم ظلم وستم کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی عشق کی گرمی سے محروم ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ وہ اللہ میاں سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں:-

خلقِ خُدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دِین و علم و فن بندگی ہوس تمام
عشقِ گرہ کُشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی!

فرشتے لینن کے نقطۂ نظر کی پُرزور، مدلّل اور مؤثر تائید کرتے وقت اس حقیقت کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں کہ ''رند وفقیہ ومیر وپیر'' سبھی خلقِ خُدا پر جبر واستبداد کے پہاڑ توڑنے والوں ہی میں شامل ہو گئے ہیں۔ گویا وہ مذہب جو خلقِ خُدا کو جبر واستبداد سے نجات دلانے کے لیے آیا تھا اُسے ان اداروں نے جبر و استبداد کا دستگیر اور خلقِ خُدا کا دشمن بنا کر رکھ دیا ہے۔ ''دانش ودین'' اور ''علم وفن'' خُدا کی بندگی کی بجائے ہوس کی پوجا میں مشغول ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ عشق کی تلوار نیام سے باہر آئے اور خلق خدا کو ظلم وستم اور جبر واستبداد سے نجات دلائے۔

یہ لینن اور فرشتوں کے فکر و اظہار میں اس کامل ہم آہنگی ہی کا کرشمہ ہے کہ اللہ میاں فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ فی الفور دنیا میں مروج سرمایہ دارانہ نظام کو مٹا کر زمین پر اللہ کی حاکمیت کا بول بالا کر دیں۔ نظم کے اس تیسرے اور آخری حصے کا عنوان ہے: ''فرمانِ خُدا (فرشتوں سے)''۔ آیئے خُدا کا یہ فرمان سارا کا سارا پڑھ ڈالیں:-

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

یہ نظم اقبال کی اسلامی انقلابی آرزومندی کی دین ہے۔ ''یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے'' کے مصداق اقبال کی یہ تمنا تھی کہ روسی اشتراکیت دہریت یعنی ''لا'' کی منزل سے آگے بڑھ کر الا اللہ کے مقام تک پہنچے۔ سوال یہ ہے

کہ اقبال روس کے اشتراکی انقلاب کو دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کا ایک ناگزیر پیش خیمہ کیوں سمجھتے ہیں؟ اس سوال کا ایک سرسری سا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ دار یورپ نے قریب قریب ساری دُنیائے اسلام کو غلامی کے جال میں گرفتار کر رکھا تھا۔ جن کے لیے فقط اللہ کی بندگی مقدر ہو چکی تھی اُن کا حکمران طبقہ فرنگ کی بندگی پر نازاں تھا۔ ما ہمہ عبدِ فرنگ آں عبدہٗ' اور ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش۔ یورپ کے اشتراکی انقلاب نے سرمایہ داری نظام کی خُدائی کے سامنے ''لا'' کا نعرہ بلند کر دیا تھا۔ سرمایہ دارانہ استعمار کی خُدائی سے انکار نے مسلمانوں کے سامنے سامراجی غلامی سے انکار کا راستہ روشن کر دیا تھا۔ مغرب میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مابین کشمکش نے مغربی سامراج کو کمزور کر دیا تھا۔ ایسے میں اقبال اپنے ارتقائی نقطۂ نظر کے ساتھ یہ سوچنے لگے تھے کہ روسی اشتراکیت سرمایہ داری نظام کے خاتمے کے بعد کسی روحانی مسلک کو اپنا لے گی۔ یہ بات انھوں نے سرفرانس ینگ ہسبنڈ کے نام اپنے کھلے خط میں بھی برملا کہی تھی کہ اشتراکی روس کے بارے میں یہ سوچ غلط ہے کہ وہ کبھی بھی کوئی روحانی مسلک نہ اپنائے گا۔ انھوں نے اس خط میں دھمکی آمیز انداز میں سرفرانسس کو بتایا تھا کہ جب اشتراکیت خدا پر ایمان لے آئے گی تب اسلام کے بہت قریب آ جائے گی۔ چنانچہ اقبال سرمایہ دارانہ استعمار کی شکست و ریخت میں اشتراکی روس کے کردار کو اسلامی انقلاب کا اولین مرحلہ سمجھتے تھے۔

اقبال کی اس آرزومندی کو فلسفیانہ انداز میں سمجھنا ہو تو ہمیں اقبال کی کتاب ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کا وہ باب پڑھنا چاہیے جس میں کلمہ طیبہ کی تفسیر کی گئی ہے۔ لا الہ الا اللہ کے زیرِ عنوان اقبال لا اور الا کو نفی اور اثبات کی دو منزلیں قرار دیتے ہیں۔ جھوٹے خُداؤں کی نفی کے بغیر سچے خُدا کا اثبات ناممکن ہے۔ اشتراکی روس نے فرنگی تہذیب کے اندر بندگی اور خواجگی کے درمیان جنگ برپا کر دی تھی۔ اقبال نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان اس جنگ کے احوال و مقامات ''پیامِ مشرق'' میں پیش کیے ہیں۔ یوں تو انھوں نے فلسفی اور مزدور،

موسولینی اور قیصر ولیم، نوائے مزدور کی سی نظموں میں اس جنگ کی مصوری متعدد حسین پیرایہ ہائے بیان میں کی ہے مگر نظم ''قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور'' دنیائے ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس مختصر نظم میں اقبال مزدور کی سادہ لوحی اور سرمایہ دار کی عیاری کو خوبصورت طنزیہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:-

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن
گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروم نہد زمن
باغ بہشت و سدرہ و طوبا ازآن تو
تلخابۂ کہ دردِ سر آرد ازآن من
صہبائے پاکِ آدم و حوا ازآن تو
مرغابی و تدرو و کبوتر ازآنِ من
ظلِ ہما و شہپر عنقا ازآن تو
این خاک و آنچہ در شکم او ازآنِ من
وز خاک تا بہ عرش معلا ازآنِ تو

اس تقسیم میں سرمایہ دار نے تمام تر مادی وسائل تو اپنے حصے میں رکھ لیے اور سارے کے سارے روحانی خواب و خیال مزدور کی جھولی میں ڈال دیے۔ قرآن کریم کے معاشی تصورات کی روشنی میں جب وہ یورپ میں برپا سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں قرآن مزدور کا دستگیر دکھائی دیتا ہے۔ ''بانگِ درا'' کی ایک چھوٹی سی نظم میں وہ کہتے ہیں:-

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناساز گار
حکم حق ہے لیس الانسان الا ما سعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

سرمایہ دار اور مزدور کے اس قسمت نامہ پر اقبال کے ابلیس کا یاد آ جانا قدرتی سی بات ہے۔ اپنی مجلس شوریٰ کے اجلاس سے افتتاحی کلمات میں ابلیس اپنے اس کارنامے پر بھی ناز کرتا ہے کہ ناداروں کو اُسی نے تقدیر کا سبق پڑھایا ہے اور سرمایہ داروں کو اُسی نے سرمایہ داری کے جنون میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اقبال سمجھتے تھے کہ اشتراکیت نے یورپ میں جہاں بندۂ مزدور کو اپنا مقدر خود سنوارنے کا درس دیا ہے وہاں مزدوروں کو سرمایہ داری نظام کے خالق و مالک ابلیس کے سامنے ''لا'' کا نعرہ بلند کرنے کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ ابلیسی نظام کی نفی خدائے واحد کی تلاش کا اولیں مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر ''لا'' کی کارفرمائی دیکھیے:-

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ
بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آن نظامِ کہنہ را برہم زدست
تیز نیشے بر رگِ عالم زدست
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الہ
فکرِ او در تند بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے الا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لا نیا ساید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات
لا و الا ساز و برگ امتاں

نفی بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل
تانگردد لا سوے الا دلیل
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیش نمروداں بزن
ایں کہ می بینی نیر زد بادو جو
از جلالِ لا الہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست
جملہ موجودات را فرمانرواست

زندگی کی جدلیات میں نفی اور اثبات کی کارفرمائی کو اپنے فلسفیانہ دینی شعور کی روشنی میں پیش کرتے وقت اقبال نے مسلمانوں کو اس قرآنی حکمت کو سمجھنے کا مشورہ دیا ہے کہ سچی توحید پرستی اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک شہنشاہیت، پاپائیت اور دیگر جھوٹے خُداؤں کے بُت پاش پاش نہ کر دیئے جائیں۔ اشتراکی روس نے دُنیائے انسانیت کو لاسلاطین، لاکلیسا، لا الہ کی منزلوں پر پہنچا کر تمام جھوٹے خُداؤں کی نفی کر دی ہے۔ اب اثبات یعنی اللہ کی خُدائی پر ایمان لانے کا مرحلہ باقی ہے۔ چنانچہ وہ اشتراکی روس کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے رہوار کو ایک بار پھر ایڑ لگائے اور الا اللہ کی منزل پر آ پہنچے۔ اقبال یہ مشورہ چند سال پیشتر اپنی عہد آفرین تخلیق ''جاوید نامہ'' میں بھی پیش کر چکے ہیں۔

''جاوید نامہ'' کے فلکِ عطارد پر مولانا جلال الدین رومی کی معیت میں اقبال سید جمال الدین افغانی سے ملاقات کرتے اور دُنیائے اسلام کو درپیش بحرانی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ سید جمال الدین افغانی اقبال کی وساطت سے اشتراکی روس کے رہنماؤں کو ایک پیغام بھجواتے ہیں۔ اس پیغام کا لب لباب بھی یہی ہے کہ اگر اشتراکی انقلاب نفی کی منزل پر ہی رک کر رہ گیا تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا

جو اس سے پہلے اسلامی انقلاب کا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اشتراکی روس کو یہ پیغام بھجواتے ہیں کہ وہ مسلمان قوم کی سرگزشت سے عبرت حاصل کرے۔ اپنی تقدیر کو اقوامِ مشرق کے ساتھ وابستہ کرے اور مغرب سے اٹھنے والے نئے فتنوں سے ہوشیار رہے۔ مغرب کے اُس پُرانے بت کدے کی طرف نہ دیکھے جس کے باطل خُداؤں کا کام خود اُس نے تمام کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ ''لا'' کے مقام سے ''الا'' کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرے۔ جب اشتراکی روس لا سے الا کی جانب اپنا رختِ سفر باندھے گا تو اُسے قرآن کریم کی روشنی کی ضرورت پڑے گی۔ جمال الدین افغانی اپنے پیغام میں قرآن کریم سے روشنی لینے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اشتراکی روس کو بتاتے ہیں کہ حکمتِ قرآنی ابھی تک پوری طرح بروئے کار نہیں آ سکی۔ اب وقت ہے کہ اس حکمت کو ایک سچے انقلابی پروگرام میں ڈھالا جائے تاکہ انسان کی تاریک رات ختم ہو اور ایک نئی، تابندہ تر اور پائندہ تر صبح طلوع ہو سکے:۔

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی
دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں
قیصریت را شکستی استخواں
تا برافروزی چراغے در ضمیر
عبرتے از سرگزشتِ ما بگیر
پائے خود محکم گزار اندر نبرد
گردِ ایں لات و ہبل دیگر مگرد
ملتے می خواہد ایں دنیائے پیر
آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر!
باز می آئی سوئے اقوامِ شرق
بستہ ایامِ تو با ایامِ شرق

تو بجاں افگندۂ سوزے دگر
در ضمیرِ تو شب و روزے دگر!
کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں
سوے آں دیرِ کہن دیگر مبیں
کردۂ کارِ خداونداں تمام
بگذر از لا جانبِ الا خرام
در گزر از لا اگر جویندہ
تا رہِ اثبات گیری زندہ
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے؟
داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کُن از اُمُ الکتاب
در گزر از جلوہ ہائے رنگ رنگ
خویش را دریاب از ترکِ فرنگ!

عہدِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اشتراکی روس نے نہ تو اپنے مقدر کو مشرق سے وابستہ کیا اور نہ ہی ترکِ فرنگ پر آمادہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ کہ ردِ انقلاب کی تباہی سے دوچار ہو کر اُسی سرمایہ داری نظام کی چاکری پر مجبور کر دیا گیا جس کے خلاف ردِ عمل کے طور پر کارل مارکس نے اشتراکیت کا فلسفہ پیش کیا تھا۔ اسی اشتراکی فلسفے کو ایک انقلابی سیاسی پروگرام کی شکل دے کر لینن کی قیادت میں روس میں انقلاب برپا ہوا تھا۔ اقبال نے اس انقلاب سے یہ اُمید باندھی تھی کہ یہ انقلاب دوبارہ سرمایہ داری کے شکم کا ایندھن بننے کی بجائے نفی سے اثبات کی منزل کی طرف گامزن ہوگا۔ حقیقت کی دُنیا میں تو یہ اُمید پوری نہ ہو سکی مگر اقبال نے لینن کو خُدا کے حضور پیش کر کے خواب وخیال کی دُنیا میں اشتراکی انقلاب کو اسلامی انقلاب کی جانب پیش قدمی کرتے

ہوئے دکھا دیا۔ چنانچہ اقبال کی نظم بارگاہِ خداوندی میں لینن کی وکالت اس شان کے ساتھ کرتی ہے کہ فرشتے اُس کے ہمنوا بن جاتے ہیں اور اللہ میاں فرشتوں کو اسلام کے انقلابی معاشی تصورات کے نفاذ کا فرمان جاری کر دیتے ہیں۔

ہمارے حکمران طبقہ نے اب تک خُدا کے فرمان پر سرے سے غور ہی نہیں کیا۔ اس فرمان کی ایک ایک شق نفاذ طلب ہے۔ اس فرمان کا نفاذ مخصوص مفادات کے حامل جن طبقات کے لیے یومِ حساب کا حکم رکھتا ہے اُن کے ذوق اور ذہنیت سے اگر اقبال بخوبی آگاہ ہیں تو اللہ میاں اُن سے ناامید ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دُنیا کے غریبوں کو جگا دیں، غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے گرما دیں، پیرانِ حرم کو حرم سے نکال باہر کریں، خالق و مخلوق کے درمیان حائل پیری، ملائی اور سلطانی کے پردے اُٹھا دیں تاکہ غریب اور مظلوم خلقِ خُدا امیروں کے محلات کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دے اور یوں دُنیا میں معاشی انصاف کا بول بالا ہو۔

علامہ اقبال نے کسان کو جاگیردار اور مزدور کو سرمایہ دار کے پنجۂ ظلم سے آزاد کرانے اور قرض کے شکنجے سے رہا کرانے کی خاطر شعر و حکمت اور سیاست و معیشت، ہر دو، سے خوب کام لیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے ایسی ایسی چونکا دینے والی باتیں کر رکھی ہیں جو نہ تو اُن سے پہلے اور نہ ہی اُن کے بعد کسی کو کہنے کی جرأت ہوئی ہے۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ انھوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے ۳۲ء کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا تھا کہ برصغیر میں اسلام کا مستقبل مسلمان کسان کی آزادی پر منحصر ہے۔ انھوں نے مسلمان نوجوانوں کی قوتِ عمل کو مہمیز دیتے ہوئے ملک بھر میں یوتھ لیگز اور کلچرل سنٹر کے قیام کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ یہ یوتھ لیگز:-

> ''اپنی تمام تر توجہ خدمتِ خلق، اصلاحِ رسومات اور قصبوں اور دیہات میں اقتصادی پروپیگنڈے پر صرف کریں۔ اب حالات ۲۵ء کے چین کی طرح ناگوار صورت اختیار کر چکے ہیں۔ میں چاہتا

ہوں کہ نوجوانوں کی یہ جماعتیں خوب اقتصادی پروپیگنڈہ کریں اور کسانوں کو زمینداروں کے پھندوں سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا انحصار مسلمان کاشتکار کی آزادی پر ہے۔ آیئے شباب کی آگ کو ایمان کی آگ میں حل کر ڈالیں تاکہ ہم آنے والی نسلوں کے لیے عمل کی ایک نئی دُنیا تخلیق کر سکیں۔''

اس مقصد کے حصول کی خاطر علامہ اقبال نے اپنی شاعری سے دو کام لیے ہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے اپنی شاعری میں کسان اور مزدور کی غلامی اور مظلومیت کا دردناک نقشہ پیش کیا ہے۔ میں اس کی مثال میں اُن کے فقط دو ایک شعر پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں:-

دہقان ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن اُس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

....

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب!

اور دوم یہ کہ انھوں نے اپنی شاعری کے جادو سے کسان اور مزدور کو خوابِ غفلت سے جگا کر جاگیردار اور سرمایہ دار کے خلاف بغاوت کا درس دیا ہے۔ انھوں نے غریبوں اور مظلوموں کو مختلف اور متنوع انداز میں یہ بات بتائی ہے کہ اب اُس کی رات ختم ہونے کو آ رہی ہے، افق پر سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو ہے ضرورت فقط اس بات کی ہے کہ وہ سحر کی آذان سنیں اور خود کو ظلم و ستم سے آزاد کرنے کی جدوجہد کا آغاز کریں۔ اپنی ایک نظم میں اقبال نے کسان سے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے بدن کی خاک میں

دل کا دانہ کاشت کرے تاکہ سرزمین دل میں بغاوت اور انقلاب کی فصل پروان چڑھ سکے۔ کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور، ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء) میں وہ مغرب کے سرمایہ داری نظام کو رد کر کے اسلام کے اقتصادی نظام کے نفاذ کی بڑی مؤثر وکالت کرتے ہیں:-

"This is the inevitable outcome of a wholly politicalcivilization which has looked upon man as a thing to be exploited and not as a personality to be developed and enlarged by purely cultural forces. The peoples of Asia are bound to rise against the acquisitive economy which the West has developed and imposed on the nations of the East. Asia cannot comprehend modern Western capitalism with its undisciplined individualism. The faith which you represent recognises the worth of the individual, and disciplines him to give away his all to the service of God and man. Its possibilities are not yet exhausted. It can still create a new world."[1]

اقبال ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ نظامِ اشتراکیت کے معاشی تصورات کو وہ اسلام کے معاشی انصاف کے تصورات سے بڑی حد تک ہم آہنگ سمجھتے تھے۔ وہ اشتراکیت کو کوئی مذہب نہ سمجھتے تھے بلکہ اُن کی نگاہ میں اشتراکیت کا نظام ایک ایسا

''معاشی تجربہ تھا جو دُنیائے اسلام کی سرحدوں کے آس پاس روبہ عمل تھا اور جس سے دُنیائے اسلام سبق اندوز ہو کر قرآن کریم کی معاشی حکمت اور حکمت عملی کی جانب متوجہ ہو سکتی'' تھی۔ اُن کی یہ اُمید اُن کی متعدد اردو اور فارسی نظموں کی صورت گر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اشتراکی روس کی گرمیٔ گفتار بے سود نہیں جائے گی بلکہ دُنیائے اسلام اس سے متاثر ہو کر قرآن حکیم کی قل العفو سے شروع ہونے والی آیۂ کریمہ کا مفہوم سمجھ پائے گی۔ اس آیۂ کریمہ میں اس معاشی تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ دولت صاحب ثروت لوگوں کے پاس خُدا کی امانت ہے جو شخص اپنی ضروریات سے زائد دولت کو خُدا کی راہ میں یعنی خلق خُدا کی معاشی ضروریات پورا کرنے پر خرچ نہیں کرتا وہ اللہ کا مجرم ہے۔ قرآن حکیم کی معاشی تعلیمات کو جدید معاشی اصطلاحات میں بیان کرتے وقت اقبال یہ تک کہہ دیا کرتے تھے کہ ''اسلام بھی ایک طرح کا سوشلزم ہے''(۲)

علامہ اقبال کو آغاز کار ہی سے معاشی مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ اپنے وطن کی معاشی پسماندگی اور اُس سے پیدا ہونے والے اخلاقی اور روحانی امراض کا جیسا جاگتا احساس علامہ اقبال کے ہاں پایا جاتا ہے اُس کی مثال اُن کے معاصرین میں ڈھونڈنے کو بھی نہیں ملتی۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ علامہ اقبال کی پہلی کتاب نہ تو شعروادب سے متعلق ہے نہ فلسفہ وتصوف سے بلکہ اُس کا نام ہے ''علم الاقتصاد''۔ اب سے لگ بھگ ایک سو سال پہلے سن ۱۹۰۳ میں شائع ہونے والی یہ کتاب اردو زبان میں معاشیات کے علم پر پہلی کتاب ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں اقبال لکھتے ہیں:-

> ''غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی رُوح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں

میں چیکے چیکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟''

اقبال اپنے دلِ دردمند سے اٹھنے والے اس آتشیں سوال کا جواب ان الفاظ میں دیتے ہیں:-

''اس کا انحصار زیادہ تر ان واقعات اور نتائج پر ہے جو علم الاقتصاد کے دائرہ تحقیق میں داخل ہیں۔ اس واسطے یہ علم انسان کے لیے انتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ قریباً قریباً ضروریات زندگی میں سے ہے۔''

یہاں دو باتیں بے حد معنی خیز ہیں۔ اول یہ کہ معاشرے میں معاشی عدل و انصاف کی تلاش نوجوان اقبال کو اقتصادیات کے علم کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے اور دوم یہ کہ وہ معاشیات کے علم کی تحصیل کو ضروریاتِ زندگی میں سے ایک بنیادی ضرورت قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اقبال بیسویں صدی کے آغاز تک منظرِ عام پر آنے والے معاشی نظریات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علم معاشیات کا بنیادی موضوع خود انسان ہے۔

ہر چند علامہ اقبال نے اپنی زندگی ایک محکوم ملک میں بسر کی تھی مگر اپنی حیرت انگیز پیش بینی کے ساتھ انھوں نے یہ جان لیا تھا کہ اسلامی مشرق کی غلامی کی تاریک رات کا ختم ہو جانا ناگزیر ہو کر رہ گیا ہے اور بہت جلد ساری کی ساری دُنیائے اسلام مغرب کی براہِ راست غلامی سے آزاد ہو جائے گی۔ چنانچہ اپنی وفات سے صرف دو سال پیشتر اپنی معرکتہ الاراء کتاب: پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، میں انھوں نے مستقبل کے نو آزاد مشرق کی تعمیر نو کی بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اقوامِ مشرق کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سیاسی آزادی کے حصول کے فوراً

بعد انھیں اس سیاسی آزادی کو اقتصادی اور تہذیبی آزادی بنانے کا چیلنج در پیش ہوگا۔ اس کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ آزاد مشرق کو کیا کرنا چاہیے؟ اس اعتبار سے اُن کا یہ مجموعۂ کلام مشرق کی کامل آزادی کا ایک انقلابی منشور ہے:-

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟
باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید

....

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ
تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ؟
زخم ازو، نشتر ازو، سوزن ازو
ما وجوے خون و امید رفو!
خود بدانی پادشاہی قاہری است
قاہری در عصرِ ما سوداگری است
تختۂ دُکاں شریکِ تخت و تاج
از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است
بر زبانش خیر و اندر دل شر است
گوہرش تف دارد در لعلش رگ است
مشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است

اقبال اقوامِ مشرق کو مغربی استعمار کی قید سے رہائی کی جو تدبیریں بتاتے

ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ مشرق کی قوموں کو مغرب کی بالواسطہ غلامی یعنی مغربی دُنیا کی نو استعماری پالیسیوں سے خبردار رہنا ہوگا۔ آج کی دنیا میں سات سمندر پار بیٹھ کر ریموٹ کنٹرول سے آزاد مشرقی اقوام کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی غلامی کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے مشرق کی قوموں کو فرنگ یعنی مغربی سامراج کے ہتھکنڈوں سے باخبر رہنا ہوگا۔ اقبال کے نزدیک عہدِ حاضر میں سیاست سوداگری بن کر رہ گئی ہے۔ تختۂ دکان شریک تخت و تاج۔ دکان کا تھڑا ہی تختِ شاہی بن کر رہ گیا ہے۔ مغربی استعمار کی اصل قوت سوداگری میں پنہاں ہے۔ اس لیے اقوامِ مشرق کو چاہیے کہ وہ خود اپنے وسائل پر انحصار کریں:۔

بے نیاز از کارگاہِ او گزر
در زمستاں پوستینِ او مخر
کشتنِ بے حرب و ضرب آئینِ اوست
مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست
بوریائے خود بہ قالینش مدہ
بیذقِ خود را بہ فرزینش مدہ
رہزنِ چشمِ تو خوابِ مخملش
رہزنِ تو رنگ و آبِ مخملش
صد گرہ افگندۂ درکارِ خویش
از قماشِ او مکن دستارِ خویش
ہوشمندے از خمِ او مے نخورد
ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد
وقتِ سودا خند خند و کم خروش
ماچو طفلانیم و او شکر فروش
محرم از قلب و نگاہِ مشتری است

یا رب ایں سحر است یا سوداگری است
تاجرانِ رنگ و بو بردند سود
ما خریداراں ہمہ کور و کبود

اقبال کا مشورہ یہ ہے کہ ہم ان اقوام کے ریشم پر اپنے کھدر کو ترجیح دیں۔ اپنے بوریا کو ان کے قالین سے افضل قرار دیں۔ جب یہ مغربی قومیں تجارت کرتی ہیں تو ان کی زبان پر مٹھاس ہوتی ہے مگر ان کے دل میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ یہ اتنی چالاک قومیں ہیں کہ ہم ان کے سامنے گویا بھولے بھالے بچے ہیں اور یہ ہمیں بہلانے کے لیے شکر کی گولیاں کھلاتے پھرتے ہیں۔ اقبال خبردار کرتے ہیں کہ فرنگی تمھیں بہلا پھسلا کر تمھارا خام مال اونے پونے داموں لے اُڑیں گے اور پھر اسی خام مال سے صنعتی مال تیار کر کے تمھاری جیب کاٹنے آ دھمکیں گے۔ ان سے محبت اور وفا کی توقع ہرگز نہ رکھنا۔ اس سے بڑی نادانی کیا ہوسکتی ہے کہ جس نے ہمیں زخمی کیا ہے اور ہم اُس کے لگائے ہوئے زخموں سے بہنے والے خون کی ندی میں پڑے تیرتے ہیں اُسی سے ہم اپنے زخموں کو سینے کے لیے سوئی مانگتے ہیں اور مرہمِ اندمال کی توقع رکھتے ہیں۔ اُس کا کام تو ہمیں زخمی کرنا اور ہمارا خون بہانا ہے وہ ہمیں ہرگز صحت مند نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ فقط اپنی ذات پر اور صرف اپنے وسائل پر انحصار کریں اور اپنی اقتصادی خودی کی تعمیر کر کے طاقتور قومیں بنیں۔ (مومنِ خود، کافرِ افرنگ شو) غیروں سے مانگی تانگی طاقت ہماری طاقت نہیں ہے ہمیں خود اپنے وسائل کو دریافت کرنا ہے، ترقی دینا ہے اور نئے علوم کی روشنی میں سائنس و حرفت کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے ہیں۔ صرف اور صرف اسی طرح ہم صحیح معنوں میں آزاد اور خود مختار قومیں بن سکتے ہیں۔ اپنی اقتصادی خودی کی تعمیر کے بغیر ہم اپنی قومی خودی کی نہ تو بازیافت کر سکتے ہیں اور نہ اُس کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

آج ہمارے اقتصادی منصوبہ سازوں کو ایک نظر علامہ اقبال کی پہلی کتاب "علم الاقتصاد" پر بھی ڈال لینی چاہیے اور اقبال کے آخری شعری کارناموں

میں سے ''پس چہ باید کرد'' میں پوشیدہ حکمت اور حکمتِ عملی پر بھی بار بار غور کرنا چاہیے۔ اقبال نے آج سے ایک صدی پیشتر لکھا تھا کہ تعلیم اور اقتصادی ترقی لازم وملزوم ہیں۔ اقبال کے خیال میں جب تک تعلیم عام نہ ہوگی تب تک اقتصادی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح اقبال نے آبادی کی منصوبہ بندی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے شادی بیاہ اور اُس سے متعلق خاندانی رسوم کی اصلاح کو بھی وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا تھا۔ اقبال نے اپنی شاعری اور اپنی فلسفیانہ تحریروں میں عمر بھر نہ صرف معاشی ظلم کے خلاف احتجاج کیا ہے بلکہ اس ظلم کو مٹا کر معاشی انصاف کے ایک نئے نظام کے قیام کی بنیادیں بھی فراہم کی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم اقبال کے تصورات کو پاکستان میں ایک عادلانہ معاشی نظام کے نفاذ کی بنیاد بنائیں۔

....

حواشی

(۱) سید عبدالواحد (مرتب) "Thoughts and Reflections of Iqbal"۔ لاہور، ۱۹۶۴ء، (ص ۲۱۲۔۲۱۳)۔

(۲) "The Bombay Chronicle". سے انٹرویو۔ پورے متن کے لیے دیکھیے بشیر احمد ڈار (مرتب) "Letters and Writings of Iqbal"۔ اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۷ء، (صفحہ ۵۷)۔

علامہ اقبال کے ایک سو پچیسویں جشنِ ولادت کی مناسبت سے سالِ رواں کو سالِ اقبال کا نام دیا گیا ہے۔ سنگِ میل پبلی کیشنز نے اقبالیات کے ساتھ اپنی پُرانی اور گہری وابستگی کے پیشِ نظر اقبال کے اس جشنِ ولادت (۲۰۰۲ء) میں بھرپور شرکت کا فیصلہ کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلہ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔

فتح محمد ملک

ادبیات

تعصبات
اندازِ نظر
تحسین و تردید
اقبال فکر و عمل
فیض، شاعری اور سیاست
احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار
اپنی آگ کی تلاش
ن۔م۔راشد
سعادت حسن منٹو

پاکستانیات

کشمیر کہانی
فکری تنگدستی اور نظریاتی بیگانگی کا موسم
غلاموں کی غلامی
Punjabi Identity

کشمیر اور فلسطین

فلسطین اردو ادب میں
تحریکِ آزادیِ کشمیر، اردو ادب کے آئینے میں

Rs. 225.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1339-8

